قیمت: پانچ روپے

انٹرنیشنل

ملی ٹائمز

نئی دہلی

اُردو کا پہلا بین الاقوامی ہفت روزہ

مسلم یونیورسٹی دھواں دھواں

محمود الرحمٰن کی جادوئی چھڑی

ٹوٹ گئی

ریاستی دہشت گردی کے سب سے بڑے

مبلغ کی موت

پر خصوصی تحریر

Country	Price
AUSTRALIA	A$ 3.50
BANGLADESH	Taka 20
BELGIUM	Fr 70
BRUNEI	B$ 4.50
CANADA	C$.3.50
CHINA	RMB 12.50
DENMARK	D. KR. 14.00
FRANCE	Fr 10
FINLAND	F. MK 10.00
GERMANY	DM3.50
HONG KONG	HK$ 15.00
INDONESIA	RP 3,400 (INC.PNN)
ITALY	LIT. 3,000
JAPAN	
KOREA	W 1.800
MALAYSIA	RM 3.00
MALDIVES	Rf 12.00
NETHERLANDS	G 3.30
NEW ZEALAND	NZ$ 4.95
NORWAY	N. KR 12.00
PAKISTAN	Rs. 15
PHILIPPINES	P 25
SAUDI ARABIA	SR 3
SINGAPORE	S$ 2.50
SRI LANKA	Rs 40
SWEDEN	Kr 15
SWITZERLAND	Fr 3
THAILAND	B 40
U.K.	60p.
U.S.A.	$1.25

مسلمانوں پر مرکزی حکومت کی ”عنایات و نوازشات“ کی بارش

تعلیمی و فلاحی اسکیموں کے نفاذ کے لیے پانچ اہم شہروں میں مرکزی دفاتر کا قیام

مسلمانوں پر مرکزی حکومت کی عنایات و نوازشات کی بارش کا سلسلہ جاری ہے۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے مختلف پروگراموں پر عمل کرنے کا اعلان کردیا گیا ہے۔ اس کے لئے وزیراعظم نے ایک تین رکنی پینل تشکیل دیا ہے جو اس سمت میں ہونے والی کارروائیوں کی رپورٹ حکومت کو دے گا۔ اس کے علاوہ ایک مرکزی وزیر اسلم شیر خان کو ان مسلم نمائندوں سے رابطہ قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے جو رائے عامہ بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت مختلف اسکیموں اور منصوبوں کو نافذ کرنے کے لئے پانچ مقامات پر اپنے دفاتر بھی کھولنے جارہی ہے۔ بمبئی میں اس کے لئے جگہ کا بھی انتخاب کرلیا گیا ہے۔ مرکز نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک میڈیکل کالج کھولنے کا بھی فیصلہ کرلیا ہے اور ادھر مسلمانوں کو لبھانے کے لئے مایاوتی حکومت کے خاتمے کے بعد سے اب تک اترپردیش میں آٹھ کروڑ روپے مسلمانوں میں تقسیم کئے جاچکے ہیں۔

مرکز بمبئی کے علاوہ آسام، بھوپال اور لکھنؤ میں بھی دفتر کھولنے جارہا ہے۔ مدارس کی جدید کاری کے لئے اردو کمپیوٹر اسکیم اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی متناسب نمائندگی کی بھی باتیں کی جارہی ہیں۔ ان اسکیموں کے تعلق سے مادھو راؤ سندھیا، عبدالرحمن انتولے اور اسلم شیر خاں کافی سرگرم ہیں۔ مرکز نے ریاستی حکومتوں کو ہدایات دی ہیں کہ وہ مسلم بستیوں میں اسکول کھولنے کا کام فوری طور پر شروع کردیں۔ اس سلسلے میں اگر فنڈ کی ضرورت ہو تو اقلیتی مالیاتی کارپوریشن سے رقم لی جاسکتی ہے۔ اسلم شیر خاں نے کئی ریاستوں کا دورہ کرکے یہ جاننے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا رجحان کیا ہے اور انہیں کس طرح کانگریس میں واپس لایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں ہر جگہ مسلمانوں کو جذباتیت سے دور رہ کر سنجیدہ روی اختیار کرنے کی اپیل کی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ وزیراعظم نے اسلم شیر خاں کو مسلمانوں کے معاملے میں فیصلے کرنے کا اختیار دے رکھا ہے۔ کیونکہ ان پر نہ تو سرکاری مسلمان ہونے کا اور نہ ہی فرقہ پرست مسلمان ہونے کا ٹھپہ لگا ہے۔ جبکہ اس سے قبل مسلم سیاست کرنے والے جعفر شریف، غلام نبی آزاد، سلمان خورشید، اے آر انتولے وغیرہ پر سرکاری مسلمان کا ٹھپہ لگا ہے۔

کانگریس کے ذرائع کے مطابق کانگریس قیادت علماء اور روایتی مسلم لیڈروں کے بجائے دوسرے قسم کے مسلمانوں سے اپنا کام نکالنا چاہتی ہے۔ کیونکہ کانگریس کے جائزے کے مطابق بابری مسجد کے انہدام کے بعد ان دونوں قیادتوں پر سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ چکا ہے اور نوجوان مسلم نسل ”قومی دھارے میں شامل ہونا چاہتی ہے۔ کانگریس نے تحفظ، باز آباد کاری، مالی تعاون، تکنیکی تعلیم اور ملازمتوں کے مواقع پر توجہ دینے کا پلان بنایا ہے۔ تقریباً ایسے دو سو اضلاع میں جہاں کہ مسلمانوں کی معتدبہ تعداد موجود ہے، مسلمانوں کی عزت نفس پر خاص توجہ دی جائے گی۔ مسلم ٹیچرس، سماجی ورکر اور سیاستدانوں سے کہا جارہا ہے کہ بی جے پی کانگریس کے متبادل کی حیثیت سے ابھرنا چاہتی ہے اس لئے مسلمانوں کو بہت ہی ہوشیاری سے ان دونوں پارٹیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ کانگریس پارٹی نے حکومت سے کہا ہے کہ پولیس اور مسلم دستوں میں بھی مسلمانوں کی شمولیت تیز کی جائے

وزیراعظم نرسمہاراؤ نے وزیر خارجہ پرنب مکھرجی، سابق ایڈیشنل سالیسٹر جنرل دیویندر دویدی اور پنڈت این کے شرما پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی ہے جو پندرہ نکاتی پروگراموں پر عمل آوری کا جائزہ لے کر اس کی رپورٹ وزیراعظم کو پیش کرے گی۔ اس کمیٹی کی تشکیل پر کانگریس کے ایک حلقے میں شدید ناراضگی ظاہر کی جارہی ہے۔ ناراضگی ظاہر کرنے والوں میں جعفر شریف، غلام نبی آزاد اور طارق انور ہیں۔ طارق انور چونکہ کانگریس اقلیتی سیل کے صدر ہیں اس لئے مسلم معاملات میں وہ اپنی مداخلت کا حق چاہتے ہیں جبکہ آزاد اور جعفر شریف اب تک مسلم سیاست کرتے رہے ہیں اور اس بار ان لوگوں کو راؤ نے الگ تھلگ کردیا ہے۔ دراصل انہیں اس وجہ سے بھی الگ تھلگ کیا گیا کہ انہوں نے پارٹی کا کام دیکھنے کی راؤ کی اپیل ٹھکرا دی تھی اور پھر مسلمانوں میں ان کی کوئی امیج بھی نہیں ہے۔ مسٹر دویدی نے این ڈی تیواری گروپ اور کانگریس کے درمیان ثالث کا رول ادا کیا تھا۔ این کے شرما نے حال ہی میں ایس بی چوان کا بریلی کا دورہ ترتیب دیا تھا۔ پرنب مکھرجی نے بھی حال ہی میں اردو اخبارات و رسائل کے مدیروں کے ساتھ ایک میٹنگ کی تھی۔ شاہی امام سے بھی کانگریس رابطہ قائم کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ گویا مسلمانوں پر چاروں طرف سے جال پھینک دیا گیا ہے۔

یہ سب کچھ عام انتخابات کے پیش نظر کیا جارہا ہے اور چونکہ مسلمان کانگریس کو کسی بھی طرح اپنانے کو تیار نہیں ہیں اس لئے مختلف بہانوں سے انہیں راغب کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا مسلمان راؤ کی ان چالوں میں پھنس جاتے ہیں یا بابری مسجد کی شہادت کا انتقام ملک گیر سطح پر لیتے ہیں۔

آئندہ چند برسوں میں مسلم آبادی میں اضافہ کی شرح کم ہوجائے گی

مسلم خواتین میں تعلیم کے عام ہونے سے افزائش نسل کا رجحان متاثر

عام تصور کے برعکس ملک میں مسلم آبادی میں اضافے کی شرح آئندہ چند برسوں میں گھٹنے والی ہے۔ اگرچہ خاندانی منصوبہ بندی کے ذرائع اختیار کرنے میں آج بھی خاصی دشواریاں ہیں لیکن تعلیم نے مسلمان خواتین میں شرح افزائش کے رجحان کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

مردم شماری کی ایک رپورٹ کے مطابق ہندو آبادی میں ۲۲،۸ فیصد، مسلم آبادی میں ۲۳،۶ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ رپورٹ میں درج فہرست ذاتوں کی آبادی میں ۳۱ فیصد کی شرح اضافہ کو مسلمانوں کی شرح سے قابل موازنہ قرار دیا گیا ہے۔ اس اعداد و شمار میں آسام اور جموں کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔

نیشنل کونسل آف اپلائڈ اکنامک ریسرچ کے فروغ وسائل انسانی کے شعبے کا کہنا ہے کہ یہ اعداد و شمار خام مواد کی حیثیت رکھتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مردم شماری کے اعداد و شمار کو اس طرح استعمال میں نہیں لایا جاتا اور سیاستدانوں کو چاہئے کہ ایسے اعداد و شمار کا براہ راست حوالہ نہ دیں۔ تاہم آبادی کا مطالعہ کرنے والے ماہرین کا خیال ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم آبادی میں اضافے کی شرح نسبتاً زیادہ ہے اور اس ضمن میں ایسے موثر پروگرام پر تجربہ کرنے کی ضرورت ہے جس سے لوگ خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اختیار کرنے کی طرف راغب ہوں۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کا مشاہدہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اختیار کرنے کا رجحان بڑھا ہے اور اس کے ساتھ ہی مانع حمل اشیاء کے استعمال کے فروغ کے لئے مسلم خاندانوں سے رابطے کی رفتار میں تیزی آئی ہے۔

نیشنل کونسل آف اپلائڈ اکنامک ریسرچ کے مذکورہ شعبے کے سربراہ ابو صالح شریف کے نزدیک یہ اس امکان کی طرف اشارہ ہے کہ آبادی کی شرح اضافہ میں تناسبی فرق آئندہ خاصا کم ہوجائے گا۔

ہندو بنیاد پرستوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کی آبادی اس حساب سے ہندوؤں سے بڑھ جائے گی گوکھلے انسٹی ٹیوٹ آف پالی ٹکس اینڈ اکنامکس، پونہ میں مسلم آبادی کے موجودہ رجحان پر مبنی ایک مطالعے میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی آبادی موجودہ شرح اضافہ کے حساب سے دو سو سال بعد بھی ۲۰ فیصد رہے گی۔ اور شرح اضافہ کے تناسبی تفاوت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو تو بھی یہی صورت حال دو سو سال تک باقی رہے گی۔

عورتوں میں خواندگی کی بڑھتی ہوئی شرح نے ہندو اور مسلم دونوں فرقوں کی عورتوں میں افزائش نسل کے رجحان کو روکا ہے۔ ہندو خاندانوں کی ناخواندہ ماؤں کے مقابلے میں ایسی ہی ثانوی سطح تک تعلیم یافتہ ماؤں میں زرخیزی تیس فیصد کم ہوئی ہے جبکہ دونوں زمروں کی مسلم عورتوں میں زرخیزی کا فرق ستائیس فیصد ہے۔ تعلیم کی اثر پذیری کا یہ فرق تہذیبی اختلافات کی بناء پر ہے۔

۱۹۹۰ء میں آپریشنز ریسرچ گروپ کی طرف سے ایک سروے میں مذہب، تعلیم کی سطح

باقی ص ۱۳ پر

مسلم یونیورسٹی دھواں دھواں، طلباء کا مستقبل داؤ پر

محمود الرحمان کی جادوئی چھڑی ٹوٹ گئی

رپورٹ - سہیل انجم

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ایک بار پھر ہنگاموں کی نذر ہو گئی، شام مصر اور شب شیراز کا جادو ایک بار پھر پارہ پارہ ہو گیا۔ بڑی امیدیں اور توقعات

وابستہ کی گئی تھیں محمود الرحمن سے۔ لیکن ساری امیدیں پاش پاش اور ساری توقعات ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ محمود الرحمن جیسا ایڈمنسٹریٹر یونیورسٹی کیمپس کو ہنگامہ آرائیوں سے بچا نہیں پایا بلکہ ان میں اپنے پیش رووں سے بھی زیادہ الجھ گیا۔ طلباء اور وائس چانسلر میں محاذ آرائی کی نوبت آگئی اور باپ بیٹوں کا شفیق اور معزز رشتہ معاندانہ چشمک میں بدل گیا۔ نہ تو طلباء نے وائس چانسلر کے مقام و مرتبہ کا لحاظ رکھا اور نہ ہی وائس چانسلر نے اپنے وقار کے شایان شان کوئی قدم اٹھایا۔ طلباء کی شرانگیزیوں کو جہاں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا وہیں وائس چانسلر کے اقدامات کی بھی مذمت کرنی پڑے گی۔ بحران کو زور آزمائی اور طاقت کے مظاہرہ سے نہیں بلکہ بردباری، سنجیدہ روی اور دور اندیش حکمت عملی سے حل کیا جانا چاہیے۔ لیکن محمود الرحمن نے حالات پر قابو پانے کے لئے جو چھڑی استعمال کی وہ جادو کی چھڑی نہیں تھی اور اگر جادو کی مان بھی لیں تو پھر یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہو گا کہ وہ جادو کی چھڑی ٹوٹ گئی اور یونیورسٹی دھواں دھواں ہو گئی۔

محمود الرحمن کی آمد سے قبل ان کے نام کا بڑا چرچا تھا اور چونکہ کامیاب اور تجربہ کار ایڈمنسٹریٹر رہے ہیں اس لئے ان سے توقعات کی وابستگی حیرت انگیز بھی نہیں تھی۔ انہوں نے عہدہ سنبھالنے سے قبل چند قومی اخباروں کو جو انٹرویو دئے تھے ان سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کیمپس کو غنڈہ گردی، بدعنوانی، اقربا پروری، مفاد پرستی، کٹا کلچر اور ہر قسم کی برائی سے پاک کردیں گے لیکن اب یہ پتہ چلا کہ ان برائیوں کے جراثیم اب بھی موجود ہیں، اب بھی ہنگامہ آرائی کی روایت زندہ ہے، بدعنوانی و مفاد پرستی کا دور دورہ ہے اور کٹا کلچر نے ترقی کر کے "پستول کلچر" کی شکل اختیار کرلی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے کٹا شرپسند طلباء کے ہاتھوں میں ہوتا تھا اب پستول وائس چانسلر کے ہاتھ میں ہے۔ آرٹس فیکلٹی کے سامنے ہونے والے ہنگامہ کے دوران انہوں نے اس کا مظاہرہ بھی کیا اور مخالفانہ آواز اٹھانے والے طلباء کو سمجھا بجھا کر خاموش کرنے کی کوشش کے بجائے پولیس دستے کا سہارا لے کر وہاں اپنی عمل داری قائم کرنے کی کوشش کی۔

ان کی آمد سے قبل داخلوں میں دھاندلی کا بڑا چرچا تھا نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ سابق وائس چانسلر ہر کس و ناکس کا داخلہ ایک فون پر کرلیا کرتے تھے۔ موجودہ وی سی نے اس روایت کو ختم کرنے کا عزم ظاہر کیا تھا۔ لیکن ابھی نصف سال بھی نہیں گزرا کہ ان پر بھی ایسے ہی الزام لگنے لگے۔ ان پر الزام ہے کہ انہوں نے بھی فون

> بڑی امیدیں اور توقعات وابستہ کی گئی تھیں محمود الرحمن سے۔ لیکن ساری امیدیں پاش پاش اور ساری توقعات ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ محمود الرحمن جیسا ایڈمنسٹریٹر یونیورسٹی کیمپس کو ہنگامہ آرائیوں سے بچا نہیں پایا بلکہ وہ تو ان میں اپنے پیش رووں سے بھی زیادہ الجھ گیا۔

پر داخلے کئے ہیں۔ دہلی سے کسی وزیر نے فون کیا اور انہوں نے اس کے امیدوار کو داخلہ دے دیا۔ اطلاعات کے مطابق پی ایم ہاؤس سے بھی اس نوعیت کے فون کئے گئے اور طلباء کا کہنا ہے کہ وی سی نے کسی کو مایوس نہیں کیا۔ کچھ طلباء لیڈروں نے جب اس طرح داخلہ ہوتے دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے امیدواروں کو داخلہ دلوانے کی کوشش کی جسے وی سی نے نامنظور کر دیا۔ وی سی کا کہنا ہے کہ یہ طلباء لیڈران داخلے کرانے کے لئے رشوتیں لیتے تھے۔ ہم نے ایسے داخلوں پر پابندی لگا کر ان کے ذریعہ آمدنی کو بند کر دیا جس کی بناء پر وہ ہنگامہ آرائی پر اتر آئے۔ لیکن طلباء کا کہنا ہے کہ جب آپ دوسروں کو داخلہ دے رہے ہیں تو ان کے امیدواروں کو کیوں نہیں دیتے۔

ذرائع کے مطابق ہنگامہ ۱۲ نومبر کی شام کو اس وقت شروع ہوا جب کنٹرولر آف اگزامنیشن پروفیسر ہمایوں مراد نے شام ساڑھے پانچ بجے کنٹرولر آفس کا گیٹ بند کروا دیا۔ گیٹ بند ہونے کے تھوڑی دیر بعد طلبا یونین کے سابق نائب صدر معراج الدین نے آکر گیٹ کھولنے کو کہا جس پر گیٹ پر موجود سنتری نے انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ معراج الدین مبینہ طور پر اسے گالیاں دیتے ہوئے واپس چلے گئے لیکن ایک گھنٹہ کے بعد وہ چار پانچ ساتھیوں کے ساتھ پھر آئے اور گیٹ کھولنے کو کہا۔ ڈیوٹی پر موجود اسحاق کے منع کرنے پر ان لوگوں نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی اور جبراً آفس کھلوا کر ہمایوں مراد کے کمرے پر قبضہ کرلیا۔ اس کی اطلاع جب وی سی کو ملی تو انہوں نے پولیس بلوا کر ان کو گرفتار کروا دیا۔ لیکن ایک طالب علم بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگلے دن وی سی کے یہ کہنے پر کہ ان کی ضمانت سے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ان کی ضمانت ہو گئی اور پھر ان لوگوں نے اطلاعات کے مطابق ہنگامہ کرنا اور کلاسز کا بائیکاٹ کروانا شروع کر دیا۔ اسی ہنگامے میں آرٹس فیکلٹی کے سامنے وی سی اور طلباء میں ٹکراؤ ہوا۔ وی سی نے جو کہ کمانڈوز کے ساتھ تھے ریوالور دکھا کر طلباء کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ جس پر طوفان برپا ہو گیا اور لڑکوں نے گاڑیوں کو نذر آتش اور پتھراؤ کرنا شروع کر دیا۔ جس میں کئی گاڑیاں جن میں وی سی کی بھی گاڑی شامل ہے تباہ ہو گئیں۔ وی سی کی رہائش گاہ بری طرح برباد ہو گئی۔

اس ہنگامے کے بعد وائس چانسلر نے یونیورسٹی کو غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دیا لیکن یہ حکم اتنی سختی سے نافذ کیا کہ جن طلباء میں ان کی امیج اچھی تھی وہ بھی ان سے برگشتہ ہو گئے انہوں نے طلباء کو حکم دیا کہ وہ اپنے تمام تر سامان کے ساتھ ہوسٹل خالی کردیں اور جو سامان نہ لے جاسکیں اسے ہوسٹل کے کامن روم میں جمع کروادیں۔ طلباء کمروں کو کھلا چھوڑ دیں انہیں مقفل نہ کریں تاکہ غیر سماجی عناصر اور غنڈہ

طالب علموں کا پتہ لگایا جاسکے اور اس کی بھی نشاندہی کی جاسکے کہ ہوسٹلز میں باہری لڑکے تو نہیں رہتے۔ ایک طرف ایسا سخت حکم نافذ کیا گیا اور دوسری طرف ٹرینوں اور بسوں کا معقول بندوبست نہیں کیا گیا جس کے سبب طلبا کو اپنے گھروں کو لوٹنے میں زبردست دقتوں کا سامنا

> اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے بہت سارے غلط فیصلے لئے ہیں اور موجودہ ہنگامے سے نمٹنے کے لئے بھی انہوں نے جو طریقہ کار اپنایا وہ بالکل غلط اور نامناسب تھا۔ انہوں نے اپنی سخت گیری سے اپنا بھرم توڑ دیا اور مسلمانوں میں ان کے تئیں جو تاثرات قائم تھے وہ دفن ہو گئے۔

کرنا پڑا۔ بہت سے لڑکوں کے پاس گھر جانے کے لئے پیسے تک نہیں تھے اور یونیورسٹی کی طرف سے رعایتی ٹکٹ کا بھی انتظام نہیں کیا گیا۔ اسی صورت حال میں بس اڈے اور ریلوے اسٹیشن پر لڑکوں کی زبردست بھیڑ افراتفری کے عالم میں دیکھی گئی۔ اس سے قبل بھی یونیورسٹی بارہا بند ہوئی ہے لیکن کبھی بھی اتنا سخت حکم نافذ نہیں کیا گیا۔ اس سے پہلے طلباء صرف ضروری اشیاء لے کر گھروں کو لوٹتے تھے لیکن اس بار محمود الرحمن نے غنڈہ طلباء کی نشاندہی کرنے کی کوشش میں تمام طلباء کو شک کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جو طلباء اتفاق سے یونیورسٹی میں موجود نہیں رہے ہوں کیا ان کا سامان بھی غیر سماجی عناصر اور غنڈہ طلباء کے کھاتے میں چلا جائے گا اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ ان کے سامان میں خرد برد نہیں ہوگی اور وہ جوں کا توں مل جائے گا۔

دراصل محمود الرحمن کے خلاف چھ مہینے سے طلباء کے ذہن میں ایک لاوا ابل رہا تھا جو اب جاکر پھٹ پڑا اور باہر آگیا۔ چونکہ یہ ایک سخت گیر ایڈمنسٹریٹر واقع ہوئے ہیں اس لئے انہوں نے شروع سے ہی طلبا کو اپنے دبدبے سے دبانا چاہا اور بعض اوقات تو ان کے جائز مطالبوں کو بھی نظر انداز کر دیا۔ طلباء کا الزام ہے کہ انہوں نے یونیورسٹی کو کشمیر سمجھ لیا اور اسی طرح یہاں کے حالات کو ڈیل کرنے لگے۔ اگر انہوں نے یونیورسٹی کو کشمیر نہیں سمجھا تو اب اسے کشمیر بنا دیا۔ ان سے جو پہلی غلطی ہوئی وہ یہ تھی کہ یوم سرسید کے موقع پر انہوں نے سلمان خورشید کو بلایا اور یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ سرسید ڈے کی تقریبات کا آغاز تلاوت قرآن شریف کے بغیر ہوا۔ اس سے قبل بھی ہوتا رہا ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ بھی ہوتا رہے کہ وائس چانسلر اور طلباء لیڈر یونیورسٹی کا سہارا لے کر دہلی میں سیاسی لیڈروں سے خوشگوار اور پر اثر تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ محمود الرحمن نے بھی ایسا ہی کرنا چاہا اور اس کے لئے انہوں نے خوب من مانی کی۔
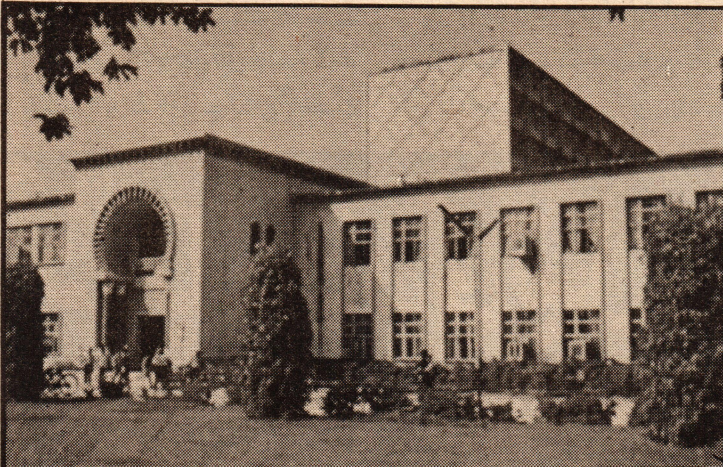
بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے بہت سارے غلط فیصلے لئے ہیں اور موجودہ ہنگامے سے نمٹنے کے لئے بھی انہوں نے جو طریقہ کار اپنایا وہ بالکل غلط اور نامناسب تھا۔ انہوں نے اپنی سخت گیری سے اپنا بھرم توڑ دیا اور مسلمانوں میں ان کے تئیں جو تاثرات قائم تھے وہ دفن ہو گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ محمود الرحمن اس بحران پر کیسے قابو پاتے ہیں اور کیا یہ اپنی مدت پوری کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

●

ملیشیا میں زبردست سیاسی انقلاب کی آہٹ

کیا ماتر محمد کا تختہ پلٹ کر انور ابراہیم خود وزیر اعظم بن جائیں گے

ملیشیا کے سیاسی پنڈت آج کل یہ پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ مہاتر محمد بہت جلد اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر انور ابراہیم کے لئے راستہ ہموار کر دیں گے۔ اخبارات مسلسل لکھ رہے ہیں کہ پارٹی اور حکومت پر مہاتر محمد کی گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ میڈیا وزیر اعظم اور نائب وزیر اعظم یعنی مہاتر اور انور کے درمیان اختلافات کی باتیں بھی کر رہا ہے لیکن دونوں رہنماؤں نے اس کی پرزور تردید کی ہے۔ لیکن ایک سیاسی مدبر کے بقول اخبارات کے پہلے صفحے پر شائع ہونے والے یہ تردیدی بیانات خود اس بات کے گواہ ہیں کہ درون پردہ کچھ اختلافات ضرور پائے جاتے ہیں۔

حال ہی میں پارٹی انتخابات میں مہاتر محمد کے بعض انتہائی قریبی ساتھیوں کی شکست نے دراصل اخبارات کو وزیر اعظم کے زوال کی پیشین گوئی پر ابھارا ہے۔ چند سال قبل مہاتر کے یہ کہہ دینے کے بعد کہ فلاں پوسٹ کے لئے فلاں شخص امیدوار ہے، دوسرا کوئی مقابلے میں نہ آتا تھا۔ مگر اس بار ایسا نہیں ہوا۔ مہاتر کے کھلے سپورٹ کے باوجود ان کے بعض انتہائی قریبی دوست انتخابات ہار گئے۔ اخبارات کا کہنا ہے کہ اس شکست کے پیچھے انور ابراہیم کا ہاتھ ہے۔ مبصرین یہ بھی کہتے ہیں کہ انور بتدریج پارٹی پر اپنی گرفت مضبوط کر رہے ہیں اور شاید وقت سے پہلے مہاتر محمد کو وزارت عظمٰی سے ہٹنے پر مجبور کر دیں۔

انور ابراہیم

مہاتر محمد اور انور ابراہیم دونوں نظریاتی اعتبار سے بھی اور عملی میدان میں طریقہ کار کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مہاتر تیز رفتار ترقی چاہتے ہیں اور اس ضمن میں بڑے سرمایہ داروں کی پذیرائی کرتے رہتے ہیں۔ انور ابراہیم اس کے برعکس ترقی کی نعمتوں کو غرباء تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ بالعموم خود کو عوام الناس سے کافی قریب رکھتے ہیں۔ مزید برآں، مہاتر کے برعکس، وہ پارٹی امور پر بھی توجہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے زیادہ تر عہدوں پر ان کے حامی فائز ہیں۔ بالعموم لوگوں کا خیال ہے کہ 48 سالہ اسلام پسند انور ابراہیم بہت جلد وزارت عظمٰی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مہاتر کے استعفیٰ کا انتظار نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی انہیں 21 ویں صدی میں ملک کو لے جانے کی مہلت دینا چاہتے ہیں۔

مگر انور ایسی خبروں کی تردید کرتے ہوئے وزیر اعظم سے اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ہیں۔ دراصل مہاتر اور انور دونوں ہی ایک دوسرے کا کافی احترام کرتے ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی صلاحیتوں کے قائل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مہاتر ہی نے انور کو اپنی نیابت کے لئے منتخب کیا اور ملک کے اگلے وزیر اعظم کے طور پر انہیں تیار کیا ہے۔ واضح رہے کہ انور اسلام پسند طلبہ تنظیم ابیم کے سابق صدر ہیں۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے ملک کے نوجوانوں میں کافی مقبول ہیں۔ چینی نسل کے لوگ انور سے خائف رہتے ہیں کیونکہ وہ ملائی مسلمانوں کی ترقی کے بارے میں زیادہ فکرمند رہتے ہیں۔

اگرچہ اخبارات و رسائل مہاتر اور انور کے درمیان اختلافات کی بات کر رہے ہیں اور یہ

ماتر محمد

پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ بہت جلد انور اپنے محسن کو ہٹا کر وزیر اعظم بننا چاہتے ہیں لیکن سچائی کچھ اور ہی ہے۔ انور نے خود ہی کہا ہے کہ وہ 1996ء میں پارٹی صدارت کے انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے۔ لیکن مبصرین کا کہنا ہے کہ تقریباً تین سال قبل انور نے یہی بات پارٹی کی نائب صدارت کے انتخاب کے وقت بھی کہی تھی لیکن بعد میں، بقول ان کے، پارٹی کے اصرار پر وہ انتخاب لڑنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ حالیہ انتخابات میں وزیر اعظم کے امیدواروں کو ہروا کر انور نے گویا الٹی میٹم دے دیا ہے کہ وہ اب ان کے لئے راستہ صاف کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ انور اپنے حامیوں کے ذریعے عین انتخاب کے وقت اپنے اوپر پارٹی صدارت کا انتخاب لڑنے کے لئے دباؤ ڈلوائیں اور پھر یہ کہیں کہ پارٹی کے کارکنوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہیں مجبوراً انتخاب میں حصہ لینا پڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مہاتر شکست کھا کر بے عزت ہونے کے بجائے باوقار طریقے سے مستعفی ہو جائیں گے۔

لیکن انور اور پارٹی دونوں مہاتر کو ملیشیائی سیاست کے منظر سے یوں ہٹانا پسند نہ کریں گے۔ اسی لئے بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ دونوں رہنماؤں میں اختلاف نہیں بلکہ مکمل مفاہمت پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں کی پالیسی کے تحت ہو رہا ہے

باقی صفحہ ۱۳ پر

آذربائیجان کی تیل کی دولت کو ہڑپنے کا مغربی منصوبہ

آذربائیجان سابق سوویت یونین کے زوال کے بعد سے مسلسل مسائل سے دوچار ہے۔ اس چھوٹی سی مسلم ریاست کو آزادی کے لئے بھاری قیمت چکانی پڑی ہے۔ تقریباً گذشتہ سات سال سے پڑوسی عیسائی ریاست آرمینیا سے غیر اعلان شدہ جنگ جاری ہے جس سے دس لاکھ سے زائد آذربائیجانی بے گھر ہو گئے ہیں اور ان کے ملک کا ایک خاطر خواہ حصہ تقریباً پانچویں حصہ پر آرمینیا نے قبضہ کر لیا ہے۔ جنگ شروع ہونے کے بعد آذربائیجان کا پلہ بھاری تھا مگر روس نے کھلم کھلا آرمینیا کی مدد کی جس سے جنگ میں انہیں کافی فائدہ پہنچا۔ روس نے اسی طرح اس نئی مسلم ریاست کے ان عناصر کو بھی دبانے کی بھرپور کوشش کی جو اسے اسلامی ریاست بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

روس کا مفاد دراصل آذربائیجان کے تیل سے وابستہ ہے۔ اس ریاست میں تیل بیسویں صدی کے آغاز میں دریافت ہوا اور بہت جلد ملک میں خوشحالی آگئی۔ لیکن اچانک 1917ء میں ملک کے دارالحکومت باکو پر کمیونسٹوں کے قبضہ نے اس ساری خوشحالی کا گلا گھونٹ دیا۔ اس وقت سے آج تک روس آذربائیجان کا ایک کالونی کی طرح استحصال کرتا رہا ہے۔ اس کی تیل کی ساری دولت روسیوں نے اپنی ترقی پر صرف کی ہے اور تیل انڈسٹری میں اہم مناصب پر روسی ہی قابض ہیں۔

دراصل روسیوں نے مقامی آبادی یعنی آذری مسلمانوں کو کبھی آگے بڑھانے کی کوئی کوشش کی ہی نہیں۔
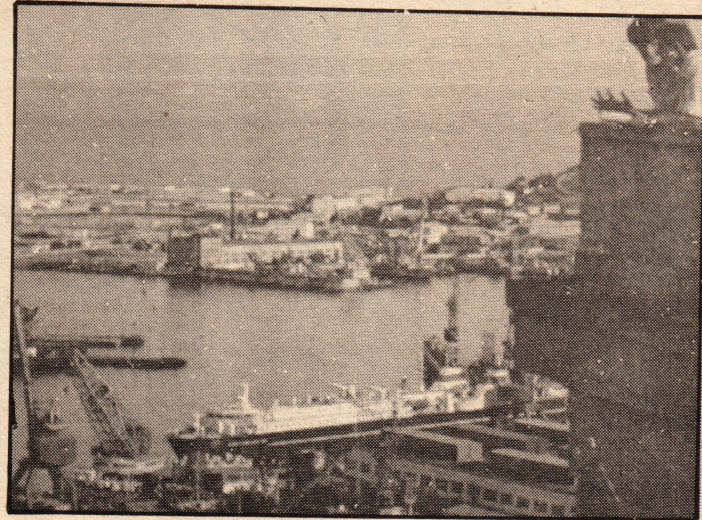
لیکن اب کم از کم آذربائیجان کے تیل پر روسی تسلط ڈھیلا پڑتا دکھائی دے رہا ہے۔ روس کی مخالفت کے باوجود مغربی ممالک کی تیل کی 11 کمپنیوں نے گذشتہ دنوں ایک پلان کا اعلان کیا ہے جس سے اس چھوٹی مسلم ریاست کی تیل کی دولت کا روسی مزید استحصال نہیں کر سکیں گے۔ اس پلان کے مطابق یہ کمپنیاں دو پائپ لائنیں بچھائیں گی جو آذری تیل کو مغربی بازار تک پہنچانے میں مدد کریں گی۔ ایک تو وہی پرانی پائپ لائن ہے جو روس سے گزرتی ہے اور آذری تیل کو بحر اسود کے ساحل تک پہنچاتی ہے۔ اس پائپ لائن کی وجہ سے آذری تیل دولت پر روسیوں کا اچھا خاصا کنٹرول تھا۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے مغربی کمپنیاں ایک دوسری پائپ لائن بچھانا چاہتی ہیں جو جارجیا کے راستے ترکی تک جائے گی اور وہاں سے بہ آسانی آذری تیل مغرب کے بازاروں میں فروخت ہو سکے گا۔ ترکی حکومت بھی اس پلان سے خوش ہے۔ کیونکہ اس پائپ لائن کے بعد اس کو وہ معاشی و فوجی اہمیت دوبارہ حاصل ہو جائے گی جو کبھی عراقی پائپ لائن کے کام کرنے کی صورت میں اسے حاصل تھی۔ ترکی حکومت نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دو سو ملین ڈالر کی مدد سے نہ صرف اپنے علاقے سے گزرنے والی پائپ لائن بنوائے گی بلکہ آذربائیجان کے علاقے میں کئی لائن بھی ترکستانی بچھائیں گے۔

مغربی کمپنیوں کے پلان کو تمام ہی لوگوں نے استقبال کیا ہے۔ آذری خوش ہیں کہ ان دو پائپ لائنوں کے بعد وہ اپنی سیاسی و معاشی آزادی کی زیادہ بہتر انداز میں حفاظت کرنے کے ساتھ اپنے عوام کی غربت بھی دور کر سکیں گے۔ لیکن کتنے ہی آذری باشندے شاکی ہیں کہ نئی دولت کا زیادہ حصہ چند لوگوں نے ہتھیا لیا ہے۔ ترکی، جارجیا اور قزاخستان کے لوگ خوش ہیں کہ چونکہ یہ پائپ لائن ان کے علاقوں سے گزرے گی اس لئے انہیں بھی اس کا مالی فائدہ ملے گا۔ لیکن سب سے زیادہ امریکہ اور اس کے مغربی ممالک خوش ہیں۔ دراصل آذری تیل دولت پر روسی کنٹرول ختم کرنے کے لئے امریکہ نے کھل کر مغربی کمپنیوں کی مدد کی۔ امریکہ کی کوشش ہے کہ تیل سپلائی کے نئے ذرائع تلاش کر کے اس انرجی کے لئے مغربی ممالک کا مغربی ایشیا پر انحصار کم سے کم کر دیا جائے۔ ظاہر ہے اس امریکی پالیسی کا براہ راست اثر خلیجی ممالک پر پڑے گا مگر اپنی بقا کے لئے امریکہ پر مکمل طور سے انحصار کرنے کی وجہ سے وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس کے جارحانہ اقدامات کے خلاف کوئی کارروائی کر سکیں۔

پھر یہ بات بھی اہم ہے کہ آذربائیجان روس سے چھٹکارا تو ضرور حاصل کر سکتا ہے لیکن مغربی ممالک کچھ زیادہ بہتر ثابت نہ ہوں گے۔ ان ممالک پر بہت زیادہ معاشی انحصار آذربائیجان کی سیاسی آزادی کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ •

آذربائیجان کے تیل پر مغرب کی نظر

سعودی دارالحکومت دہشت گردی کی زد میں

کیا اس دھماکہ سے حکومت کو کوئی خطرہ لاحق ہو گیا ہے؟

گذشتہ دنوں سعودی دارالحکومت ریاض میں ہونے والے کار بم دھماکہ کو حقوق انسانی کے حلقوں میں بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ مغربی یوروپ میں واقع انسانی حقوق کی ایجنسیوں اور قیام امن کے لئے کام کر رہی بے شمار تنظیموں نے اس واقعہ میں اپنی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے گو کہ ابھی تک اس مسئلہ پر کوئی رسمی بیان جاری نہیں کیا ہے البتہ باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ اس واقعہ کو انسانی حقوق سے جوڑنے اور ایک مدلل رپورٹ کی تیاری کے لئے ایمنسٹی نے اقدامات کئے ہیں۔

دوسری طرف لندن میں مقیم ناراض سعودی گروپ لجنہ حقوق شرعیہ کی فاکس مشینوں میں بھی خاصی حرارت آگئی ہے اور اسے سعودی دارالحکومت میں ناراض گروپوں کی کامیابی کا ایک واضح ثبوت باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ گویا مغرب کی اسلام دشمن حکومتیں ہوں یا مغرب میں مقیم ناراض سعودیوں کا گروپ، ہر کوئی اس واقعہ کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے خواہ ایسا باور کرانا حقائق سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو۔

جزیرۃ العرب میں سعودی عرب وہ واحد ملک ہے جہاں اسلامی شعائر کا احترام عام ہے۔ کٹر مولویوں کی معاشرے پر گرفت آج بھی موجود ہے اور جہاں شریعت کی چھوٹی چھوٹی خلاف ورزیوں پر بھی علماء حساس ہیں اور سماجی طور پر اب تک مغرب پسندوں کو تسلیم نہیں کیا جا سکا ہے۔ حرمین شریفین کا ملک ہونے کی وجہ سے سعودی عرب کے اس سخت تر اسلامی رویے کو ایک طرح کا بین الاقوامی اعتبار بھی حاصل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مغربی مبصرین اسے اسلامی قدامت پسندی کا گڑھ بتاتے ہیں۔

گو کہ مغرب سے نئی ٹکنالوجی برآمد کرنے میں سعودی عرب کسی دوسرے خلیجی ملک سے بہت آگے ہے لیکن جدید سعودی عرب کے معمار شاہ فیصل شہید کے سخت اسلامی رویے سے سعودی عرب ماڈرنائزڈ ہونے کے باوجود ویسٹرنائزڈ ہونے سے بچا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مصر کی طرح یہاں نہ تو عرب قوم پرستی کی تحریک کو تقویت ملی۔ اور عین ناصر کے عہد میں فیصل مرحوم کی کوششوں سے بعض بین الملکی ادارے وجود میں آئے اور مسلم دنیا کی ایک الگ شناخت کا داعیہ عام دلوں میں شدت اختیار کرتا گیا۔

البتہ خلیج کی جنگ کے بعد سعودی عرب پر بیرونی اور اندرونی حملے اچانک تیز ہو گئے۔ مغرب ہر قیمت پر سعودی وسائل پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے ہر اس عمل کو تقویت پہنچائی جس سے ملک کے اندر امن عامہ کو خطرہ ہو لہٰذا دو سال پہلے امریکہ میں ایک سعودی سفارت کار کو بعض نیوکلیائی رازوں کے افشا کرنے پر خصوصی تحفظ اور پناہ عطا کیا گیا اور دنیا بھر میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ سعودی عرب اپنے مالی وسائل کو ایٹم بم کی تیاری میں استعمال کر رہا ہے۔ اور اس امر کے ثبوت میں سعودی سفارت کار خلیوی کے انکشافات کو پیش کیا گیا۔ دوسری طرف یورپ میں انسانی حقوق کی تنظیموں نے سعودی عرب میں انسانی حقوق کی پامالی کا شور بلند کرنا شروع کیا اور ایسا معلوم ہوا گویا ملک کے اندر اچانک انسانی حقوق کی پامالی کا سلسلہ چل پڑا ہو۔ حالانکہ ان تمام رپورٹوں میں بیرونی کارندوں کی ریشہ دوانیاں اور مقامی لوگوں سے بدمعاشگی کے وہ واقعات درج نہ تھے جو عام طور پر گاہے بہ گاہے خود سعودی پریس میں بھی آتے رہتے ہیں۔ یہاں انسانی حقوق کا صرف ایک مطلب تھا اور وہ یہ کہ ملک کے اندر یا باہر سیاسی مخالفین کو انسانی حقوق کا چیمپئن باور کرایا جائے۔

> اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ریاض کا بم دھماکہ دہشت گردی کا نقطہ آغاز ہے۔ البتہ اس بات کے واضح اشارے ملتے ہیں کہ ریاض میں مقیم مغربی ایجنسیوں اور سفارت کاروں کا اس میں ہاتھ ہو۔ کیونکہ وہ اس طرح سعودی خارجہ پالیسی کو اپنے حق میں موڑنا چاہتے ہیں۔

اس وقت جن قدامت پرست سعودی علماء کو حکومت کی مخالفت کا سامنا ہے یا جو اپنے آپ کو حکومت مخالف باور کراتے ہیں ان کی تنقید میں موجودہ نظام میں پائے جانے والی بعض خرابیوں کی اصلاح تک موجود ہے۔ لیکن اس تنقید کو مغرب نے ایک خالصتاً مخالفانہ سیاسی روپ کا رنگ دیا ہے۔ اور مغرب سے شائع ہونے والے یعنی اسلام دشمن اخبارات نے کھلم کھلا ان علماء کی تائید بھی کی ہے جس سے علماء کی پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا ہے کہ آخر اسلام دشمن اخبارات آج ان کی حمایت پر کیوں اتر آئے ہیں؟۔ دوسری طرف مسعری کی قیادت میں لجنہ حقوق شرعیہ سے وابستہ ناراض سعودی گروپ کو بھی اس بات کا شدید احساس ہے کہ برطانیہ میں ان کے قیام اور ان کے حکومت مخالف مہم کی تائید کر کے برطانوی حکومت دراصل اپنا الو سیدھا کر رہی ہے۔ یا سعودی حکومت سے اپنی مطلب برآری کے لئے برطانوی حکومت مسعری اور ان کے رفقاء کو یرغمال کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ گذشتہ دنوں سعودی عرب اور برطانیہ کے تعلقات میں مسلسل خرابی آتی ہے۔ لیکن اب برطانوی حکومت مسعری کا کارڈ استعمال کر رہی ہے۔ بعض باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ جس مسعری کو مغرب کی حکومتیں کل تک بنیاد پرست مسلمان کہتی تھیں، خود اس کے ریاض سے نکلنے اور لندن میں پناہ حاصل کرنے کے پورے عمل میں ریاض میں واقع امریکی اور برطانوی سفارت کاروں کی مدد شامل رہی ہے۔ ملک کے اندر علماء کرام کا جو حلقہ سعودی پالیسیوں پر مسلسل نکتہ چینی کرتا رہا ہے اس نے بھی اب تک کوئی واضح سیاسی لائحہ عمل نہیں پیش کیا ہے۔ ایران، عراق کی آٹھ سالہ جنگ میں جب سعودی وسائل کا استعمال عراق کے حق میں ہوتا ہے اس وقت تو یہ علماء کرام صرف اس لئے خاموش رہے کہ وہاں معاملہ شیعہ و سنی کی جنگ کا تھا۔ لیکن جب اسی برادر کش پالیسی کے نتیجے میں ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی جب صدام حسین کی فوج اپنے محسنوں کی سرحدوں پر حملے کرنے لگیں تو اس وقت کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ سیلاب کا مقابلہ کیسے کیا جائے۔ امریکی مداخلت ایک ایسی ناگزیر مجبوری بن گئی جس کے اثرات سے اب بھی جزیرۃ العرب محفوظ نہیں ہے۔

اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ریاض کا بم

باقی صـ۱۳ـ پر

بوسنیا اور چیچنیا میں کامیاب مہم جوئی کے بعد اب ملی پارلیمنٹ نے ہندوستانی مسلمانوں کو پچاس سالہ سیاسی غلامی سے نجات دلانے کا فیصلہ کیا ہے

مابعد انہدام ہندوستان میں

جب مسلمانوں کا سیاسی مستقبل کسی بھی سیاسی پارٹی کے ہاتھوں محفوظ نہ ہو

جب مشرک سیاسی پارٹیوں نے اسلام اور مسلمانوں کا تقدس پامال کر رکھا ہو۔

جب ہمارے بے بس علمائے کرام اور محترم ملی شخصیات کفار و مشرکین کی جوتیاں سیدھی کرنے پر مجبور ہوں

جب عام مسلمان حالات کی شدت سے تنگ آکر پوچھتا ہو کہ وہ اس سیاسی دنگل میں کیا کرے؟

اور جب یہ واضح طور پر محسوس ہونے لگے کہ خدا کے آخری رسول کی امت پر بے بسی کے شکنجے مزید سخت ہوتے جا رہے ہیں۔

ایک ایسی سنگین صورت حال میں امت کے غیور افراد پر لازم ہے کہ وہ سیاسی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

الحمد للہ کہ

ہندوستانی مسلمانوں کو ایک سیاسی سمت عطا کرنے کے لئے ملک بھر سے اراکین ملی پارلیمنٹ اور دردمندان امت کے قافلے پٹنہ پہنچ رہے۔ جہاں

بمقام:
شری کرشن میموریل ہال
پٹنہ

۱۴/۱۵
جنوری
۱۹۹۶ء

کے پٹنہ اجلاس میں سیاسی بل کے مسودے پر بحث کے بعد اسے حتمی شکل دی جائے گی اور ان انقلابی اقدامات کا اعلان کیا جائے گا جس سے سیاسی غلامی کی زنجیریں کٹ سکیں گی۔

آپ کیا کریں؟

لازم ہے کہ ہر مسلمان تمام سیاسی اور مسلکی وابستگی سے اوپر اٹھ کر اس مہم میں شریک ہو۔

اپنے علاقے میں دردمندان امت کے بڑے بڑے جلسے منعقد کیجئے اور پٹنہ اجلاس کے لئے سفارشات ترتیب دیجئے۔

تاریک راتوں میں اٹھ کر گریہ وزاری کیجئے کہ اللہ ہمارے دلوں پر ایک راستہ منکشف کر دے۔

ہر شہر اور گاؤں سے چھوٹے چھوٹے منظم قافلوں کی شکل میں پٹنہ اجلاس میں شرکت کے لئے تیاری کیجئے۔

اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو

ڈاکٹر راشد شاذ قائد ملی پارلیامنٹ

مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کیجئے:

کمال الظفر ناظم پٹنہ اجلاس مونس، حمید پور کرجی، صداقت آشرم —— پٹنہ ۱۰

مرکزی دفتر: نیو سر سید نگر، علی گڑھ فون 400182 (0571)

دہلی دفتر: فون 6827018/6926030 (011)

ریاستی دہشت گردی کے سب سے بڑے مبلغ کا قتل

"کاش رابن کو کسی یہودی نے نہیں، کسی عرب نے مارا ہوتا"

اسحاق رابن — دنیا کی نظروں میں امن کا سپاہی لیکن درحقیقت ریاستی دہشت گردی کا سب سے بڑا مبلغ — رابن کے کیریئر کا آغاز فلسطینیوں کے قتل اور خوں ریز جنگوں سے اور خاتمہ اپنے ہی خون میں نہا کر ہوا۔ رابن پہلے "عظیم اسرائیل" کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے اپنی خدمات کے سبب یہودیوں اور صہیونیوں کی آنکھوں کا تارا بنے اور بعد میں مغربی ایشیا میں نام نہاد قیام امن کی بنیاد ڈال کر اور فلسطینیوں کو خود مختاری کے نام پر چھوٹا سا قطعہ زمین دے کر صہیونی اور مغربی دنیا کے ہیرو بن گئے۔ عالم عرب کی حالیہ تاریخ کی شرمناک جنگ کے ہیرو جو ۱۹۶۷ء میں لڑی گئی اور جو محض چھ دن میں ختم ہو گئی تھی، یہی رابن ہی تھے۔ انہی کی قیادت میں اسرائیلی فوجیوں نے مصر، فلسطین اور اردن کی زمینوں پر قبضہ کیا اور عظیم اسرائیل کی تشکیل میں بھرپور رول ادا کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت پناہ گزیں کیمپوں میں رہنے والے فلسطینیوں کا اگر کوئی سب سے بڑا دشمن تھا تو وہ اسحاق رابن ہی تھے۔

۶۷ء کی جنگ میں فتحیابی کے بعد رابن موشے دایان کے ساتھ

یہی وجہ ہے کہ جب ان کے قتل کی خبر ان کیمپوں میں پہنچی تو مظلوم فلسطینیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور لوگوں نے گلیوں میں نکل کر پرجوش اظہار مسرت کیا۔

بلاشبہ اسحاق رابن ریاستی دہشت گردی کے سب سے بڑے مبلغ تھے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد سے ہی انہیں قتل کرنے کے لئے مسلم انقلابیوں میں زبردست جوش و خروش تھا لیکن بازی ایک یہودی مار لے گیا۔ امن معاہدہ کے بعد شدت پسند یہودیوں کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ رابن اسرائیل عربوں کے حوالے کردیں گے اور اس احساس نے ان یہودیوں میں رابن کے تئیں نفرت کے جذبات پیدا کردیئے۔ یہودی مذہبی علماء بھی رابن کے خلاف تھے اور وہ ان کے حق میں بددعائیں کرتے تھے۔ ۲۷ سالہ یغال عامر نے جو کہ ایک طالب علم ہے بالآخر رابن کا قتل کردیا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا خدا کے حکم پر کیا اور اس کا اسے کوئی افسوس نہیں ہے۔

لیکن فلسطینی گوریلا لیڈر احمد جبرئیل کو اس کا افسوس ہے، انہیں افسوس ہے کہ رابن کا قتل ایک یہودی کے ہاتھوں ہوا کسی عرب کے ہاتھوں نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ رابن کو تو ہم مارنا چاہتے تھے انہیں تو کسی عرب کے ذریعہ قتل کیا جانا چاہئے تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ رابن کو پوری دنیا امن کا سپاہی کہتی ہے لیکن ہماری نظروں میں وہ سب سے بڑے ریاستی دہشت گرد تھے اور انہوں نے لاتعداد فلسطینیوں کا قتل کیا تھا۔

ایران نے بھی رابن کے قتل پر پوری دنیا کے ماتم کناں ہونے کی مذمت کی ہے

قاتل یغال عامر

۔ ایران کا کہنا ہے کہ رابن کا قتل ایک خدائی انتقام ہے۔ ایسے لوگوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ ہم دہشت گردی کی مذمت کرتے ہیں لیکن صہیونیوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ انہوں نے جس دہشت گردی کا آغاز کیا تھا رابن اسی کے شکار بنے ہیں۔ ایرانی پارلیمنٹ کے اسپیکر مسٹر ناطق نوری کا کہنا ہے کہ رابن کے قتل پر امریکہ اور پوری دنیا کا اظہار غم انتہائی شرمناک ہے۔ ان لوگوں نے مسلم انقلابی فتحی شکاکی کے قتل پر خاموشی کیوں اختیار کر رکھی تھی۔ واضح رہے کہ اسلامی جہاد نامی تنظیم کے کمانڈر شکاکی کو رابن کے قتل سے چند دن قبل مالٹا میں گولی مار کر ہلاک کردیا گیا تھا۔ غازہ پٹی میں تقسیم ہونے والے ایک ہینڈ بل میں صہیونیت کو اس کے لئے مورد الزام ٹھہرایا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ اس قتل کے پیچھے اسرائیل کا ہاتھ ہے۔ کچھ اسلامی تنظیموں کے رہنماؤں کا خیال ہے کہ شکاکی کے قتل کا حکم اسحاق رابن ہی نے دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شکاکی کے قتل پر اسرائیل میں زبردست خوشیاں منائی گئی تھیں۔ مسلم انقلابیوں نے شکاکی کی موت کا انتقام لینے کے لئے اسرائیل اور رابن کو دھمکی دی تھی، لیکن اس سے قبل کہ وہ انہیں اپنا نشانہ بناتے وہ ایک یہودی انتہا پسند کی گولیوں کا نشان بن گئے اور اس طرح عظیم اسرائیل کا خواب دیکھنے والے ایک مسلم دشمن اسرائیلی اور ریاستی دہشت گردی کے سب سے بڑے مبلغ کا خاتمہ

باقی صـ ۱۶ پر

"جس طرح یہ بِلّا ہم نے نوچ لیا رابن کو بھی ایک دن کھینچ سکتے ہیں"

رابن کے قتل سے قبل دائیں بازو کے ایک شدت پسند کی دھمکی

اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابن کی زندگی کو لاحق خطرہ بعید از قیاس نہیں تھا۔ دائیں بازو کے ایک شدت پسند نے گذشتہ ماہ جیسا کہ اسرائیلی ٹیلی ویژن پر کہا تھا کہ رابن ایک دہشت پسند ریاست کی تخلیق کرکے اور سخت اقدامات کے ذریعے یہودیوں کی زندگی کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ پھر اس نے وزیراعظم کی سرکاری کار کے ہڈ سے نوچے ہوئے آرائشی بلے کو ہاتھ میں لے کر بلند کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح یہ بلا اس کی کار سے نوچ لیا گیا ہے اسی طرح رابن کو بھی ہم کھینچ سکتے ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کا کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا کہ رابن کی مخالفت میں ایسی بات کہی گئی۔ دائیں بازو کے شدت پسند حلقے میں غم و غصے کی ایک عام لہر رابن کے اس فیصلے کے خلاف پائی جاتی تھی کہ وہ فلسطینیوں سے تازہ ترین امن مذاکرات میں طے پانے والی شرائط کے تحت مغربی کنارے سے اسرائیلی فوجوں کے انخلاء کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اور یہ ان کے نزدیک اسرائیلی سرزمین سے بے وفائی تھی۔ اور رابن کے قتل سے ایک ہفتہ قبل جنگ کا اعلان کردیا تھا۔

رابن کے قاتل ۲۷ سالہ قانون کے طالب علم یغال عامر کو ذہنی عدم توازن میں مبتلا ثابت کرنا کوئی دشوار کام نہیں ہوگا۔ اس نے پولیس کو دیئے گئے بیان میں کہا ہے کہ اسے اس حملہ کا حکم خدا کی جانب سے ہوا تھا۔ اس کے باوجود اس بات کے شواہد ملے ہیں کہ یہ مبینہ قاتل شب و شتم کی ایسی منصوبہ بند سازش میں اہم شریک کار رہا ہے جس نے اسرائیلی سیاست کے اخلاقی ضابطوں کے

> بائیں بازو کے شدت پسند حلقے میں غم و غصے کی ایک عام لہر رابن کے اس فیصلے کے خلاف پائی جاتی تھی کہ وہ فلسطینیوں سے تازہ ترین امن مذاکرات میں طے پانے والی شرائط کے تحت مغربی کنارے سے اسرائیلی فوجوں کے انخلاء کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

تمام گذشتہ معیاروں کا خون کردیا ہے۔ تل ابیب کی بار ایلان یونیورسٹی کے طلباء کا بیان ہے کہ یغال عامر ایک دائیں بازو کے انتہا پسند گروہ ایال سے وابستہ تھا اور یہ گروہ ربی میئر کاہان کی قائم کردہ تنظیم کاچ کی ایک شاخ ہے۔

اسرائیلی سیاست دوراہے پر کھڑی ہوئی ہے۔ جب سے دنیائے عرب کے تارکین وطن یہودیوں کو مضبوط سیاسی آواز حاصل ہوگئی جمہوری ذہن رکھنے والے یوروپی یہودیوں کی قائم کردہ یہ قوم تیزی سے قدامت پرستی کی راہ پر گامزن ہوگئی۔ ۱۹۷۷ء میں میناچم بیگن کے لیکڈ بلاک نے ایک ایسے پلیٹ فارم پر حلف اقتدار اٹھایا جہاں مغربی کنارے اور غزہ میں آباد ہونے کے مذہبی جواز کو بہ آواز بلند پڑھ کر سنایا گیا۔ اور یہیں سے مذہبی صہیونیت نے ہیرو کا روپ دھاکر جنم لیا۔ اس آواز پر لبیک کہنے والے ایک لاکھ تیس ہزار افراد میں سے بیشتر ایسے ہی قدامت پرست تھے جو کاہان کے پیرو کار تھے اور انہوں نے مقبوضہ علاقوں کا رخ کیا اور اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے عربوں کے خلاف تشدد کے مظاہر کو "مقدس" حیثیت بھی دے دی۔

اسرائیل نے خاصی تاخیر سے انتہا پسند گروہوں پر پابندی لگانے کے لئے جو کوششیں کیں ان میں پوری طرح کامیابی اسے نہ مل سکی۔ کاچ اور دیگر کئی تنظیموں پر پابندی گذشتہ سال ہی عائد ہو سکی جب امریکی نژاد یہودی ڈاکٹر بروچ گولڈ اسٹین نے مسجد ابراہیمی میں نماز کے دوران ۲۹ مسلمانوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا۔ کئی سو انتہا پسند آج بھی سرگرم کار ہوں گے اور اس بات سے ان کا خطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ ان میں زیادہ تر افراد فوجی تربیت یافتہ ہیں۔ مثال کے طور پر عامر ہی گولانی بریگیڈ سے تعلق رکھتا ہے اور پستول رکھنے کا داخلی لائسنس بھی اسے ملا ہوا ہے۔ اسرائیل کی داخلی حفاظتی سروس کے لئے سربراہ شن بٹ کا انتخاب کہا جاتا ہے اسی بناء پر عمل میں آیا ہے کہ ان کا خاص میدان عمل یہودی دہشت گردوں کی سرکوبی ہے۔ لیکن عامر تک ایسے ماہروں کے ہاتھ بھی نہ پہنچ سکے۔ اس کی پرورش مغربی کنارے پر نہیں بلکہ برزیلیا کے وسطی شہر میں ہوئی اور اس کے پڑوسی اور دیگر واقف کار اسے مہذب اور سنجیدہ نوجوان قرار دیتے ہیں۔

رابن کو اپنے اوپر منڈلاتے ہوئے خطرے کا علم تھا۔ حالیہ چند ہفتوں کے دوران ان کے لئے حفاظتی انتظامات کافی سخت اور وسیع کردیئے گئے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے مشیروں کی بتائی گئی ہدایات پر پوری طرح عمل نہیں کیا جن میں بلٹ پروف صدری کا عدم استعمال بھی ہے۔

یقین ہے کہ رابن کے قتل کے واقعے سے اسرائیلی پولیس کی پوری توجہ دائیں بازو کے انتہا پسندوں کی طرف مبذول ہو جائے گی۔ دائیں بازو کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے میں ماہر پروفیسر ایہود اسپرن زاک کا کہنا ہے کہ یقینا بعض انتہا پسند خوش ہوں گے لیکن وہ اتنے چالاک بھی نہیں ہیں۔ ان میں سے جو افراد عقلمند ہیں انہیں احساس ہوگا کہ یہ ایک بڑی تباہی ہے۔ موصوف نے مزید بتایا کہ انہیں ایک ماہ سے زائد عرصے سے یہ فکر دامن گیر تھی جب ایک طالب علم نے انہیں آگاہ کیا تھا کہ اس کے ساتھی وزیراعظم کو نشانہ بنانے کے بارے میں آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ لیکن پولیس کو ان دھمکیوں کا پہلے سے علم تھا۔ اور ایک قوم کو خطرے کا احساس دلانے کے لئے تل ابیب میں ایک سانحے کا وقوع پذیر ہونا گویا لازمی تھا۔

ملی ٹائمز انٹرنیشنل،

الیکشن میں تین مطالبے — جان، زبان، آبرو کی حفاظت

اس کی ضمانت دینے والی جماعت ہی ہمارے ووٹ کی حقدار ہوگی

تحریر: ڈاکٹر محمد حسن

نوٹ

آئندہ عام انتخابات کے پیش نظر مسلمانوں میں زبردست شش و پنج کی کیفیت ہے وہ سر دست یہ فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کس سیاسی جماعت کے حق میں اپنا ووٹ دیں۔ اس صورت حال میں ہماری کوشش ہے کہ سنجیدہ بحث کے اس کالم میں ایسی باتیں ابھر کر سامنے آئیں جو مسلمانوں کے لئے مشعل راہ نہ سہی کم از کم کسی قسم کی حکمت عملی اختیار کرنے میں ضرور معاون و مددگار ثابت ہوں۔ اہل فکر اور صائب الرائے حضرات کے خیالات و نظریات کو نمایاں انداز میں شائع کیا جائے گا۔ (ایڈیٹر)

پھر انتخابات کا موسم آگیا۔ اس بار ایسا لگا کہ بہت دنوں بعد آیا ہے اور بڑے انتظار کے بعد آیا ہے۔ ملک اس دوران ہر قسم کے حادثوں سے گزرا، غریب اور زیادہ غریب ہوئے امیر اور زیادہ امیر ہوئے۔ وعدوں کی فصل خوب پھلی پھولی، اقلیتوں کے سر سے جوئے خوں گزر گئی ذلتیں اور رسوائیاں اپنی حد سے گزر گئیں۔

ہم الیکشن سے کیا چاہیں؟ انصاف اور صرف انصاف۔ صرف یہ مطالبہ کافی ہے کہ ہمیں دوسرے عام ہندوستانی کی طرح سر اٹھا کر جینے کا حق ملے اور خود ہندوستان کے دستور نے جو وعدے ہم سے کئے ہیں وہ پورے کئے جائیں۔

یہ مطالبے کیا ہیں؟ کس سے ہیں؟ یہ بات واضح ہونی چاہئے اور پھر یہ مطالبات جو پورے کرنے کا عہد کریں ہمارا ووٹ انہیں کے لئے ہونا چاہئے۔

پہلا کام ہوگا۔ اپنے مطالبوں کا تعین۔ تین مطالبے بالکل صاف اور سامنے کے ہیں پہلے جان کی حفاظت، دوسرے اپنی زبان کی حفاظت اور تیسرے اپنے اداروں کی حفاظت۔ بلکہ یوں کہئے اپنی آبرو کی حفاظت۔ جو فرد یا جماعت اس کی ضمانت دے اسے ہی کو ووٹ دینا ضروری ہے (البتہ جہاں کوئی بھی پارٹی اس کی ضمانت دینے کو تیار نہ ہو وہاں اپنی کوئی حکمت عملی ڈھونڈھنی ہوگی)۔

پہلا سوال ہے جان کی حفاظت۔ فسادات کی کھلے عام ترغیب دینے والی جماعتوں کو ہر حالت میں شکست دینا اور اس کے لئے عملی طور پر تعاون کرنا سبھی اقلیتوں کا فرض ہے ظاہر ہے بی جے پی اور شیو سینا اور اس طرز کی بعض جماعتیں سرگرم کار ہیں وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے مسئلے اچھالتی رہتی ہیں کہ اس ملک کی اقلیتوں کی زندگی حرام ہوجائے۔ کبھی انہیں بنگلہ دیشی مہاجر کا خطاب دیا جاتا ہے کبھی انہیں پاکستانی قرار دیا جاتا ہے۔ کشمیر میں جو کشاکش جاری ہے وہ بھی اسی قسم کی جماعتوں کی ہرزہ سرائی کا ردعمل ہے۔ پنجاب اور کشمیر سے جو ہندو خاندان بھاگ کر دوسرے علاقوں میں چلے آئے ان کو الاؤنس اور امداد بھی دی گئی اور برابر دی جارہی ہے مگر یہ امداد کسی کشمیری مسلمان خاندان کو کبھی نہیں دی گئی۔

دوسرا سوال ہے زبان کا اور اسی کے ساتھ جڑا ہوا سوال ہے ملازمتوں کا۔ جو زبان سرکار دربار میں بولی سمجھی جاتی ہے وہی روزگار کی زبان بھی قرار پاتی ہے۔ اردو جو دو سو ڈھائی سو سال سے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے آج اپنے دیار میں خود اجنبی ہے اور اجنبی بھی ایسی کہ اس کی غزلوں کے پروگرام میں ہزاروں لاکھوں ہموطن جمع ہوتے ہیں مگر جب اسے سکھانے کا نام آتا ہے تو سب کان پر ہاتھ رکھنے لگتے ہیں۔ اور اب تو یہ حال ہوگیا ہے کہ اس مطالبے کو بھی سیاسی پارٹیوں نے اپنے منشور سے خارج کر دیا ہے۔ اقلیت کا جو حصہ فسادات کی مار کاٹ سے بچ رہے گا وہ روزگار کی چکی میں پس جائے گا یا نفرت اور کم حوصلگی کا شکار ہوجائے گا یا پھر مجبوراً خود کو اکثریتی سانچے میں ڈھال کر اپنی شناخت فراموش کرنے پر راضی ہوجائے گا۔

یہی ہو بھی رہا ہے ہم جن مسلمان ناموں کو آئی اے ایس کی فہرست میں دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوجاتے ہیں ان میں سے بیشتر نہ اردو سے واقف ہیں نہ اقلیت کے مسائل سے اور پھر تقرر کا وقت آتا ہے تو بھی وہ نہایت بے ضرر اور کم حیثیت جگہوں پر بھیج دئے جاتے ہیں اکثر تو سکریٹریٹ کے دفتر میں بیٹھے آئی اے ایس افسران کے تبادلے کے کاغذات ہی الٹ پلٹ کرتے رہتے ہیں۔

زبانیں قوموں کی زندگی کا پروانہ ہوتی ہیں اردو کو مٹا کر اس کے بولنے والوں کو زندہ نہیں رکھا جاسکتا۔

اب آئیے تیسرے مسئلے کی طرف یعنی ان اداروں کا تحفظ جنہیں اقلیت نے عزیز رکھا ہے غلط یا صحیح ان سے ان کی پہچان وابستہ ہے۔ مثالیں بہت سی ہیں لیکن حال میں بابری مسجد کا معاملہ اس کی علامت بن گیا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ایک پورے برعظیم جیسے ملک کی عدالت عالیہ اس مسئلے کو اس طرح دبائے بیٹھی ہے جیسے یہ کوئی فضول قسم کا مقدمہ ہو اس پر فیصلہ اس طرح ٹال دیا گیا ہے جیسے اس کی سرے سے ضرورت ہی نہ ہو اور اس دوران مسجد منہدم کردی جائے اور اس کی جگہ مندر باقاعدہ کام کرنا شروع کردے۔ آخر اس انصاف کا کیا کیا جائے جو ظالم کا ہاتھ اور غاصب کا گرز نہ روک سکے۔

ظاہر ہے ان تینوں عنوانات کے تحت بعض دوسرے مسائل بھی آسکتے ہیں لیکن بنیادی سوال یہی ہے کہ انصاف کون کرے گا؟

ملک میں تین قسم کی جماعتیں سرگرم کار ہیں اور انہی میں سے کوئی مستقبل کے ہندوستان پر قابض ہوگی ایک کانگریس اور اس کی حلیف، دوسرے بی جے پی اور اس کے حلیف اور تیسرے جنتا دل اور اس کے حلیف۔ جو کچھ اس وقت نظر آتا ہے وہ یہی نقشہ ہے اور ان تینوں میں سے کسی کو بھی اقلیتی مسائل کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے بعض کو ہوسکتا ہے مگر ہے نہیں بعض کو ہے مگر وہ اس کی مخالف سمت کام کررہی ہیں۔

کانگریس نے انتخابی مہم کے سلسلے میں بڑی ہوشیاری سے دو دھاری تلوار کا انتخاب کیا ہے کانگریس کے صدر اور ملک کے وزیر اعظم نے بھری بزم میں کھلم کھلا تو یہ راز کی بات کہہ دی کہ بی جے پی کے رہنما شری اٹل بہاری باجپئی ان کے گرو ہیں لہٰذا ان کی نظریاتی سمت تو اب واضح ہوگئی۔ یوں بھی اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہی ہے کہ بابری مسجد ٹوٹی تو انہی کے اشارے پر اور ممکن ہے سپریم کورٹ کے فیصلے کو لٹکائے رکھنے میں بھی انہی کا ہاتھ ہو۔ البتہ دوسری طرف اسی جماعت کا ایک گروہ، مسلمانوں کی دل دہی کے لئے سرگرم کار ہے۔

مہا دیو جی راؤ سندھیا، سیتا رام کیسری اور راجیش پائلٹ موقع موقع سے ایسی باتیں کہتے رہتے ہیں کہ بابری مسجد کے انہدام سے دکھے ہوئے دل کچھ دیر کے لئے پرانے زخم بھول جائیں۔ اب حال میں سید سبط رضی اور کبھی کبھار اسلم شیر خاں اور بھولے بھٹکے سلمان خورشید بھی اس ڈھنگ کی باتیں مناسب اور نامناسب جوش و خروش کے ساتھ کہہ ڈالتے ہیں کہ اب یہی گروہ مسلمانوں کو گھیر گھار کر کانگریس کی طرف لانے میں لگا ہوا ہے۔ وہ بھی صرف وعدوں کے بل پر کبھی حیدر آباد میں بننے والی مجوزہ اردو یونیورسٹی کے نام پر کبھی اماماں مسجد کو ماہانہ وظیفہ کے اعلان سے۔

ایک بات اور ان کے لئے حوصلہ افزا ہے اگر ملک کی بیشتر سیٹوں پر انتخاب کانگریس اور بی جے پی قسم کی جماعت کے درمیان ہوا تو مسلمان ووٹر جائے گا کہاں؟ ہار کر جھک مار کر ووٹ تو کانگریس ہی کو دے گا اور
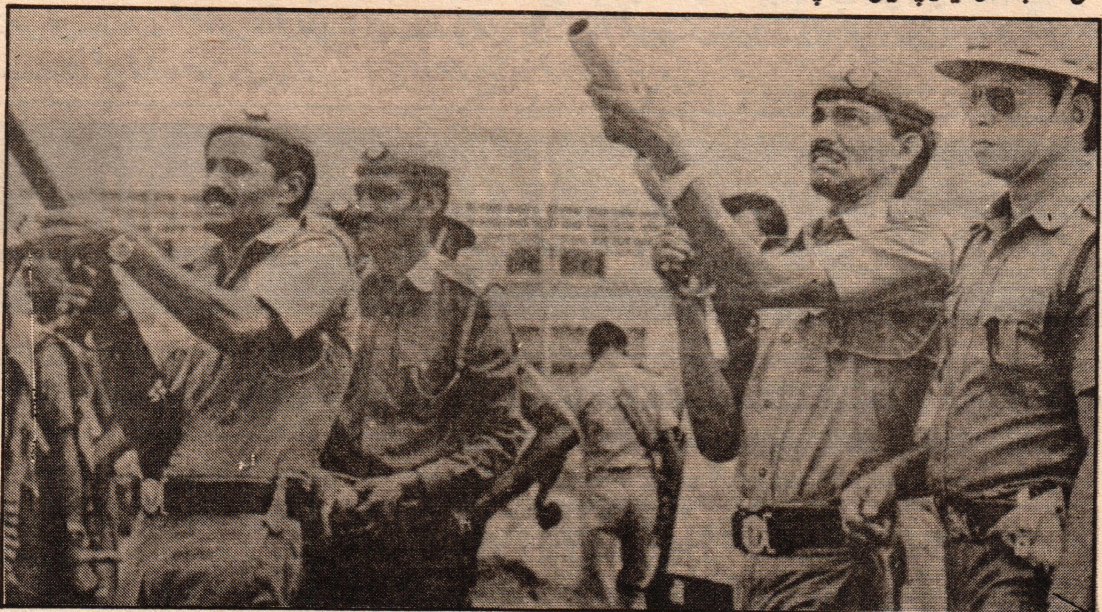
یوں ہوا تو پھر اور کیا چاہئے۔

دوسری پارٹی ہے بی جے پی وہ بہت ہاتھ پیر مار رہی ہے کہ اس بار بھی الیکشن کے لئے کوئی بابری مسجد جیسا مسئلہ ہاتھ آجائے مگر ابھی تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی اس صورت میں وہ اپنے حلیفوں کے ساتھ شیو سینا وغیرہ سے مل کر ممکن ہے کشمیر دشمنی اور پھر پاکستان دشمنی ہی کو اپنا لے اور پھر اقلیت کشی کی بنیاد پر الیکشن لڑے البتہ اس بار یہ بھی دیکھنے میں آئے گا کہ ہمارے "سیکولر" فلم صنعت کے کچھ چہرے اور کچھ پکے "مسلمان" لیڈر بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ پہلے سے کہیں زیادہ!!

تیسرا گروہ جنتا دل کا ہے بے شک اس میں اقلیت دوست اور انصاف پسند حضرات کی تعداد پہلے دونوں گروہوں سے زیادہ ہے مگر ان کی بنیادی وفاداری سیاسی اقتدار سے ہے اقلیتوں اور سماجی انصاف سے نہیں۔

رہیں دوسری پارٹیاں جن میں مسلم لیگ اور نیشنل لیگ بھی شامل ہیں سو انہیں بھی مجبوراً یا تو کانگریس کے پیچھے کھڑا ہونا پڑے گا یا پھر جنتا دل کا ساتھ دینا ہوگا۔ مگر یہ سب کچھ تو پہلے بھی ہوچکا ہے اس میں نیاپن کیا ہے؟

نیاپن ہے ضرور؟ ایک نئی بات ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی بحیثیت مجموعی کانگریس سے بیزاری۔ اور دوسری بات ہے نئے حلیف کی تلاش۔ یہ دونوں باتیں بذات خود مسئلے کا حل نہیں ہیں مگر بقول شاعر۔

گو کچھ نہیں امید تو ہے انقلاب میں

ایک بات اور — اس وقت مسلمانوں کو ایک نئی لیڈر شپ کی ضرورت ہے نہ صرف نئی لیڈر شپ بلکہ نئی قسم کی لیڈر شپ کی بھی۔ ابھی تک مسلمانوں کی رہبری کا فریضہ علماء ادا کرتے آئے ہیں۔ ملک تقسیم ہوا تو جمعیۃ علماء ہند نے رہنمائی کا فرض ادا کیا۔ مولانا حفظ الرحمن اس کام کو انجام دیتے رہے۔ پھر سیاست نے نئی کروٹ لی تو امام جامع مسجد اور سید شہاب الدین کو عروج حاصل ہوا۔ بیچ بیچ میں ڈاکٹر سید محمود کے ایماء سے قائم کردہ مجلس مشاورت کا بھی اثر و نفوذ رہا مگر اب جو نیا انداز سیاست میں آیا ہے وہ پرانے طرز و انداز سے مختلف ہے اور اس کا عرفان اور اس کے مطابق نیا رویہ اختیار کرنا پرانی رہبری کے بس کی بات معلوم نہیں ہوتی۔

انتخابات آہستہ آہستہ قریب آگئے ہیں آج مرکزی سوال انتخابات کے ذریعے ملک کے سامنے یہی آنا چاہئے اور انہی پر ملک کے عوام کو فیصلہ کرنا چاہئے باقی سب سوال اور رویے الحاقی ہیں یا ضمنی۔ مرکزی سوالات صرف دو ہیں۔

کیا ہمارا رویہ اپنے ملک کے رہنے والوں سے مذہب۔ قومیت اور نسل کی بنیاد پر طے ہوگا یا انسانی رشتوں کی بنیاد پر اور معاشی استحکام میں شرکت کی بنیاد پر طے ہوگا؟

کیا ارد گرد کے ملکوں سے ہمارا رویہ دوستی اور خیر سگالی پر مبنی ہوگا یا ٹکراؤ اور مقابلے پر؟ کیا ہماری خارجہ اور داخلہ پالیسی تناؤ اور نفرت پر قائم ہوگی یا مصالحت اور مفاہمت پر؟

اس لحاظ سے یہ انتخاب کا موسم بڑے وقت سے آیا ہے اس کے لئے ایک ایسی تنظیم کی ضرورت ہے جو امن، آشتی، انصاف اور بقائے باہم کی بھولی ہوئی قدروں کی بنیاد پر انتخاب لڑے اور ایسی طاقتوں سے سمجھوتہ کرے جو ان طاقتوں کو تقویت دے سکے۔ بابری مسجد کے حادثے کے بعد یہ دوسرا اہم موقع ہے۔ ہمارا ملک اور ہمارا معاشرہ ہمارے لئے اس طرح مقدس ہیں کہ کم سے کم اسے مسمار نہ ہونے دیجئے۔ •

بمبئی اجلاس سے بی جے پی کے لشکر کا دلی کے لیے کوچ

اقتدار کی بھوکی بی جے پی دلی پر قبضہ کے لیے ہندوتو چھوڑنے پر بھی آمادہ

بی جے پی نے پارلیمنٹ پر قبضہ کرنے اور لال قلعہ پر جھنڈا لہرانے کا بگل بجا دیا ہے۔ بمبئی میں ہوئے اس کے تین روزہ دوسرے مکمل اجلاس سے دہلی کے لئے کوچ کر دیا گیا ہے۔ بی جے پی کے لیڈروں نے اس موقع پر مختلف معاملات اور ایشوز پر جس طرح اظہار خیال کیا اور پارٹی کی پالیسی واضح کی وہ اپنے آپ میں بی جے پی کا انتخابی منشور تھا اور اسی منشور کے ساتھ عام انتخابات کی مہم کا باقاعدہ آغاز کر دیا گیا ہے۔ آڈوانی نے واجپئی کو اگلے وزیر اعظم کی حیثیت سے پھر پیش کیا ہے جبکہ واجپئی نے پارٹی ورکروں سے سو سو روپے کے چندے کی اپیل کی ہے۔ ورکرس سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دہلی پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت لگا دیں۔ انہیں جوش دلانے کے لئے اسٹیج کے پس منظر میں لال قلعہ کی مصوری کی گئی تھی اور اس کے اوپری حصے پر آگے بڑھتے ہوئے لوگوں کا اژدہام دکھایا گیا تھا۔ جس پر لکھا ہوا تھا "بڑھتے قدم اب رکیں گے نہیں۔ سنکٹوں کنٹکوں میں جھکیں گے نہیں۔" گویا اب بی جے پی پارلیمنٹ پر قبضہ کر کے اور لال قلعہ پر جھنڈا لہرا کر ہی دم لے گی۔

اس اجلاس میں جہاں مسلم پرسنل لاء، کشمیر، دفعہ ۳۷۰، ملکی سالمیت، سیاست اور جرائم کے رشتے، وندے ماترم اور دوسرے معاملات پر کھل کر اظہار خیال کیا گیا وہیں رام جنم بھومی یا کاشی اور متھرا کو یکسر فراموش کر دیا گیا۔ ہندوتو کا پلو چھوڑ کر "سماجی انقلاب" کا دامن تھام لیا گیا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ بی جے پی ۱۹۸۰ء میں ہوئے اجلاس میں واجپئی کے اس نعرے میں یقین رکھتی ہے کہ ہمیں "پڑ پرتشٹھا اور پیسہ" (عہدہ، شہرت اور پیسہ) نہیں چاہئے۔ بی جے پی کے لیڈروں نے اس اجلاس میں کانگریس کو اپنا سب سے بڑا دشمن گردانا اور بی جے پی کے بارے میں کہا کہ وہ سب سے بڑے حزب اختلاف کی حیثیت سے تو پہلے سے موجود ہے اب اسے اقتدار پر قبضہ کر لینا چاہئے۔

آڈوانی نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلم پرسنل لاء سے خواتین کو حقوق نہیں ملتے اور مساوات نہیں ہو پاتی۔ انہوں نے یکساں سول کوڈ کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو اسے قبول کر لینا چاہئے۔ وندے ماترم کے بارے میں کہا گیا کہ اگر وہ برسر اقتدار آئی تو وندے ماترم کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دے دیا جائے گا۔ کانگریسی لیڈروں کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا گیا کہ وہ مسلمانوں کی خوشامد کرتے ہیں اور ان کے اجلاس میں شرکت کرتے ہیں اس سے "ملا کریسی" کو بڑھاوا ملے گا۔ کشمیر کے بارے میں کہا گیا کہ پارٹی نومبر کے آخر میں کشمیر ہفتہ منائے گی جس کے تحت مختلف پروگرام کئے جائیں گے۔ کشمیر کو خصوصی درجہ دلانے والی دفعہ ۳۷۰ کے متعلق کہا گیا کہ اسے

بمبئی اجلاس میں بی جے پی اور سینا کے لیڈران

جلد از جلد ختم کر دینا چاہئے اور وزیر اعظم نرسمہا راؤ کشمیر پیکیج دے کر جناح سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ جناح نے دو قومی نظریہ دیا تھا تو راؤ سہ قومی نظریہ کی وکالت کر رہے ہیں۔ اس سے مسئلہ کشمیر حل نہیں ہوگا بلکہ اور پیچیدہ ہو جائے گا۔ اجلاس کے پہلے دن کشمیر پر زوردار تقریریں ہوئیں اور چیف الیکشن کمشنر سے بار بار انتخابات ملتوی کر دینے کی اپیل کی گئی۔ اس ایشو کو انتخابی ایشو بنانے کا بھی اعلان کیا گیا۔ اجلاس کے انعقاد سے پہلے سے ہی کشمیر کو ہائی لائٹ کرنے کا پلان بنا لیا گیا تھا۔ لیکن جب سیشن نے انتخابات کو ملتوی کر دیا تو بی جے پی لیڈر "دھرم سنکٹ" میں پھنس گئے۔ ان کے سامنے ایشو کی تلاش کا مسئلہ آگیا اور رات بھر میں غور و خوض کے بعد بی جے پی لیڈروں نے اپنا رخ کشمیر سے سماجی انقلاب کی طرف موڑ دیا۔ سماجی انقلاب میں تعلیم، روزگار، ملکی سلامتی و یک جہتی جیسے کئی مسائل پر روشنی ڈالی گئی اور ہندوتو کے بجائے ہندوستان پر خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ گویا بی جے پی نے اپنا رخ رامائن سے مہابھارت کی طرف موڑ لیا۔

بی جے پی صدر آڈوانی نے پھر اعلان کیا کہ اگر ان کی پارٹی اقتدار میں آتی ہے تو واجپئی وزیر اعظم ہوں گے۔ یہ کہہ کر گویا ہندوتو کے موقف کو مزید کمزور کر دیا گیا اور ان لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنے کی ایک چال چلی گئی جو بی جے پی کے ہندوتو سے خوش نہیں ہیں اور چاہتے ہیں کہ بی جے پی واجپئی کی لائن اختیار کرے تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس میں شامل کیا جا سکے۔ واجپئی بی جے پی کا لبرل چہرہ مانے جاتے ہیں اس لئے بی جے پی ایک مصلحت کے تحت ہندوتو وادی کٹر امیج کا داغ (عارضی طور پر) فی الحال اپنے دامن سے صاف کرنا چاہتی ہے۔ گویا بی جے پی ہندوتو نواز سے ہندوستان نواز بن گئی ہے۔ بی جے پی ۱۹۹۳ء میں ہونے والے انتخابات میں اپنی ناکامی کا منہ دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتی اس لئے وہ مسلمانوں کو بھی اپنے پالے میں کھینچ لانا چاہتی ہے اور اس کے

باقی ص ۱۳ پر

بال ٹھاکرے نے مسلمانوں کو پھر دھمکی دی

"دلی میں بی جے پی کی حکومت بنتے ہی ہم کاشی اور متھرا کو آزاد کرا لیں گے"

بال ٹھاکرے نے پھر منہ کھولا اور پھر زہر پاشی کی۔ کاشی اور متھرا کو "آزاد" کرانے کی دھمکی دے ڈالی اور اتنے پر اعتماد لہجے میں یہ دھمکی دی گویا بابری مسجد کی مانند ان دونوں مقامات پر بھی قبضہ کر لیں گے اور یہاں کی عبادت گاہوں کو مسمار کر دیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ عام انتخابات کے بعد مرکز میں بی جے پی کی حکومت قائم ہو رہی ہے اور اس کے بعد ان دونوں مقامات کو حاصل کرنا ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ اس وقت سب سے بڑی اڑچن تو راؤ حکومت ہے۔ یہ حکومت گئی اور ہم نے ان دونوں دھرم استھلوں کو "آزاد" کرا لیا۔

ٹھاکرے کی یہ دھمکی ایک انٹرویو کی شکل میں ان کے اپنے ہندی اخبار "دوپہر کا سامنا" میں شائع ہوئی ہے۔ بمبئی میں بی جے پی کے اجلاس کے دوسرے دن یہ انٹرویو شائع ہوا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ بی جے پی نے اپنے اس تین روزہ دوسرے مکمل اجلاس میں جہاں ہندوتو کو خیر باد کہہ دیا، آڈوانی کی جگہ پر واجپئی کی امیج کو کیش کرانے کا پلان بنایا اور جہاں رام مندر، کاشی اور متھرا کا کوئی ذکر نہیں کیا، ایک بار نام بھی نہیں لیا، وہیں ٹھاکرے نے مذکورہ دونوں مقامات پر مسلمانوں کو دھمکی دے کر شیو سینا اور بی جے پی کی مسلم دشمن پالیسی کو ایک بار پھر اجاگر کیا ہے۔

ٹھاکرے نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ رام مندر کا معاملہ ابھی جوں کا توں لٹکا ہوا ہے اور کاشی و متھرا پر بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ البتہ ان دونوں مقامات کے لئے ابھی تک کسی نے کوئی تحریک شروع نہیں کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ گرچہ شیو سینا نے اس سلسلے میں کوئی خاص تیاری نہیں کی ہے لیکن یہ تینوں مقامات اس کے سیاسی ایجنڈے میں شامل ہیں۔ "کاشی اور متھرا ہمارے مندر ہیں اور جب نئی دہلی میں بی جے پی کی حکومت بن جائے گی تو ہم ان کو لے لیں گے۔ اس وقت کاشی اور متھرا آزاد ہو جائیں گے۔" انہوں نے کہا کہ شیو سینا کے ہندو نواز موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے اور ہم اس موقف کو کمزور نہیں ہونے دیں گے۔

ٹھاکرے کے مطابق اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ راؤ حکومت ہے۔ راؤ مسلمانوں کی خوشامد کرتے ہیں انہیں خوش کرتے ہیں۔ انہوں نے سیتا رام کیسری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ

ان کے بیانات سنئے ایک دم مسلم حامی ہوتے ہیں۔ ٹھاکرے نے دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ "مسلمانوں کی خوشامد کی ایک حد ہونی چاہئے۔" کیسری کے موقف سے مسلمانوں کو فائدہ کے بجائے نقصان ہی ہوگا۔ ویسے بھی مسلمان الگ تھلگ جا رہے ہیں۔ وہ قومی دھارے سے دور ہو گئے ہیں اور کیسری جیسے لوگوں کے موقف سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے گا کہ ہندو انہیں ہراساں کر رہے ہیں۔ شیو سینا مسلم خوشامد کی پالیسی نہیں اپنائے گی۔ ایسے بہت سے مسلمان ہیں جو شیو سینا اور بی جے پی میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور پچھلے دنوں بہت سے مسلمانوں نے شیو سینا جوائن کی ہے۔ ٹھاکرے نے مزید کہا کہ ہم نہیں چاہتے کہ مسلمان ہم سے الگ تھلگ پڑ جائیں۔ ہمارے لئے مسلمان ہندوستانی شہری ہیں اور یہ ان کے لئے ایک سنہری موقع ہے کہ وہ چاہیں تو قومی دھارے میں شامل ہو جائیں۔

بال ٹھاکرے نے جہاں ایک طرف مسلمانوں کے خلاف خوب بھڑاس نکالی ہے وہیں انہیں قومی دھارے میں شامل ہونے کا مشورہ بھی دیا ہے اور مسلمانوں کو ہندوستانی شہری ہونے کی سند دے کر ایک احسان بھی کر دیا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو ٹھاکرے جیسے لوگوں کی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ مسلمانوں کو ہندوستانی شہری نہیں بھی مانتے تو نہ مانیں اس ملک کے تئیں مسلمانوں کی وفاداری کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ایک طرف ٹھاکرے مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ وہ قومی دھارے میں آجائیں اور دوسری طرف اجودھیا، کاشی اور متھرا جیسے مسائل پر مسلمانوں کے خلاف زہر بھی اگلتے ہیں۔ وہ راؤ حکومت کو رام مندر کی راہ میں سب سے بڑا روڑہ سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت کسی سے چھپی نہیں ہے۔ راؤ ہی کی کرم فرمائیوں کے نتیجے میں بابری مسجد شہید ہوگئی اور ٹھاکرے سینہ تان کر کہتے ہیں کہ ہم نے شہید کروائی ہے اور ان کے خلاف کارروائی کرنے کی جرات بھی راؤ حکومت میں نہیں ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ راؤ ہی ہیں جن کی وجہ سے آج وہ زہر اگلنے کے لئے آزاد ہیں ورنہ کوئی انصاف پسند حکومت ہوتی تو ٹھاکرے کو بہت پہلے اس کی سزا مل گئی ہوتی اور وہ شیو سینا کے ہیڈ کوارٹر میں نہیں بلکہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر انٹرویو دے رہے ہوتے۔

سنسان سڑکوں پر فوجی بوٹوں کی دھمک اور خاموش فضاؤں میں گولیوں ک

زخمی زخمی کشمیر اور چھلنی چھلنی وادی کا آنکھوں دیکھا

وادی کشمیر پر دہشت گردانہ سرگرمیوں اور احساس محرومی کے نتیجے میں سراسیمگی اور بے رونقی کی فضا طاری ہے۔ جہاں لوگوں کو زندگی کی سہولتیں بھی حاصل نہیں ہیں۔ ان کے گھر ہفتوں تاریکی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ بجلی تقریبا عنقا ہو چکی ہے۔ چھوٹے بڑے تمام تعلیمی ادارے بند پڑے ہیں ان میں سے بیشتر یا تو جل گئے ہیں یا گولیوں سے چھلنی ہو چکے ہیں۔ بارہ مولہ کا ہسپتال جو اس علاقہ کا سب سے اچھا ہسپتال تھا بالکل تباہ ہو چکا ہے اور وہاں کا اسٹاف بڑی بے کسی کی حالت میں اسے کسی طرح چلا رہا ہے۔ لوگوں کے چہرے اتنے بجھ چکے ہیں کہ امید کی کرن نام کو بھی دکھائی نہیں دیتی۔ صبح کو آپ نکلئے تو سڑکیں سنسان ملیں گی۔ صرف فوجی ٹرک اور جیپیں ہی ان پر محو خرام ہوں گی۔ ایسے میں اکا دکا مقامی باشندے ضرورت کی اشیاء خریدنے کے لئے باہر نکلے ہوئے نظر آئیں گے۔ ۲۵ سالہ عبدالاحد وازا اپنے پانچ سال کے بیٹے کا ہاتھ پکڑے ایک دوکان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس سے پوچھئے کہ کیا یہ لڑکا اسکول جاتا ہے تو وہ بتائے گا کہ سرکاری اسکول میں بچوں کو پڑھانے کا تصور ہی محال ہو چکا ہے اور لوگ چھوٹے چھوٹے پرائیوٹ انگریزی میڈیم اسکولوں کا رخ کرنے پر مجبور ہیں۔ کسی دوکان کے آس پاس کھڑے لوگوں سے آپ دریافت کریں کہ ہزاروں لوگوں کے موت کی نذر ہو جانے کے بعد بھی ان کی زبان پر آزادی کا نعرہ آج بھی کیوں ہے؟ کشمیر کے عوام ایک منتخب حکومت کو ان کے مسائل حل کرنے کا موقع کیوں نہیں دیتے تو ان کا جواب ہوتا ہے۔ "ہمارے اگائے ہوئے سارے سیب ہندوستانی کھا جاتے ہیں۔ اگر ہم یہ سیب برآمد کرنے لگیں تو کہیں زیادہ پیسے کمائیں گے۔ اسی لئے ہم آزادی چاہتے ہیں۔" ایک لڑکی کا ردعمل ان الفاظ میں سنائی دیتا ہے کہ کشمیر کی زمین ہمارے خون میں نہا چکی ہے کیا ہم اس خون کا سودا کرلیں اور انتخاب میں ووٹ دیں اور پھر اس کی آواز تیز اور مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔

ماہرین تعلیم کو اس کا اعتراف ہے کہ کشمیر کے حالات کا اثر سب سے زیادہ بنیادی تعلیم پر پڑا ہے۔ اساتذہ اور طلباء دونوں ہی تشدد کے نہ رکنے والے سیلاب سے وحشت زدہ ہیں۔ سوپور ڈگری کالج کے ایک پروفیسر کے مطابق نوجوانوں پر عجیب بے یقینی کی کیفیت چھائی ہوئی ہے اور وہ خود یہ فیصلہ نہیں کر پارہے ہیں کہ وہ کس ملک کے شہری ہیں اور اس طرح نوجوان نسل کی ذہنی نشو و نما کے امکانات معدوم ہو چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے اسکولوں اور کالجوں کے لئے اچھے کلرک پیدا کر رہے ہوں لیکن مکمل اچھے انسان نہیں پیدا کر رہے ہیں۔

سری نگر کے میڈیا ایجوکیشن ریسرچ سنٹر کے طالب علم مرتضی شبلی نے کشمیری نوجوانوں کو درپیش مصائب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "اب میں اپنے شہر میں کہیں کوئی خوبصورتی نہیں پاتا۔ سارے مناظر نے میرے ذہن کو ماؤف کر دیا ہے اور اپنا توازن برقرار رکھنے کے لئے میں ہر سال کچھ دنوں کے لئے کشمیر سے باہر چلا جاتا ہوں۔

مذکورہ صورت حال اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہاں پر مسئلہ اعتماد کے فقدان کا ہے نہ کہ سیاسی خلاء کا اور حکومت کو اسی اعتماد کی بازیابی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی نئی سیاسی سرگرمی وہاں شروع ہو ضرورت اس بات کی ہے کہ ترقی اور معاشی آبادکاری کی سمت میں کوئی موثر اقدام کیا جائے۔ ہرچند کہ اس سے مجموعی بہتری کی صورت واضح نہیں ہوگی۔ جس طرح بارہ مولہ اور سوپور جیسے دہشت گردی سے متاثرہ علاقوں میں صورت حال کو قدرے بہتر بنایا جاسکتا ہے وہ طریقہ کار اننت ناگ جیسے اضلاع میں بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ جیسا کہ ایک سرکردہ ایڈمنسٹریٹر کا خیال ہے کہ پیسہ عوام کے رجحان کو جمہوریت پسندی کی طرف مائل کرتا ہے۔

کشمیر میں خاص طور پر حکومت پر یہ اضافی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دیکھے کہ مختلف فلاحی منصوبوں کی مد میں دیا گیا پیسہ صحیح معنوں میں مستحق افراد تک پہنچ رہا ہے یا نہیں۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ دوسری ریاستوں کے مقابلے میں حکومت کشمیر پر پیسہ بہا رہی ہے لیکن شاید حق بہ حق دار رسید کی نوبت نہیں آتی۔

کشمیر میں الیکشن موخر کر دیا گیا ہے

"ہمارے اگائے ہوئے سارے سیب ہندوستانی کھا جاتے ہیں۔ اگر ہم یہ سیب برآمد کرنے لگیں تو کہیں زیادہ پیسے کمائیں گے۔ اسی لئے ہم آزادی چاہتے ہیں۔" "ایک لڑکی کا ردعمل ان الفاظ میں سنائی دیتا ہے کہ کشمیر کی زمین خون میں نہا چکی ہے کیا ہم اس خون کا سودا کرلیں اور انتخاب میں ووٹ دیں اور آواز تیز اور مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔"

الیکشن کی آڑ میں حکمراں تھوپنے کی نہیں بلکہ زخ

چیف الیکشن کمشنر مسٹر ٹی این سیشن نے کشمیر میں انتخابات پر روک لگاکر کشمیری عوام پر اپنا آدمی تھوپنے کی مرکز کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اس سے کشمیر کی طرف مرکز کے بڑھتے قدم رک گئے اور اس صورت حال سے نجات مل گئی جو وادی کے شب و روز کو مزید عدم تحفظ اور غیر یقینی کی چادر میں لپیٹ دیتی۔ وہ الیکشن جس میں ایک جماعت کے علاوہ کوئی سیاسی جماعت شریک نہیں ہوتی اور رائے دہندگان کی معمولی سی تعداد ڈرتے اور جھجکتے ہوئے اپنے آئینی حق کا استعمال کرتی، صحیح معنوں میں الیکشن نہیں

الیکشن کا ڈرامہ ہوتا اور اس ڈرامے کی آڑ میں، مرکز پھر اپنا کھیل کھیلتا، پھر قتل و خوں ریزی میں اضافہ ہوتا اور وادی کشمیر کے شب و روز میں بہتری کے بجائے ابتری مزید اپنی جگہ بنا لیتی۔

کانگریس کے علاوہ کوئی سیاسی جماعت کشمیر میں انتخابات کے حق میں نہیں تھی۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ وادی کے حالات انتخابات کے حق میں نہیں ہیں اور یہ کہ الیکشن کے بجائے پہلی ضرورت وہاں امن و امان کے قیام کی ہے جب تک عوام کو تحفظ اور اعتماد نہیں فراہم کر دیا جاتا انتخابات بے معنی ہوں گے۔ یہاں تک کہ بی جے پی بھی کشمیر میں الیکشن کی حامی نہیں ہے۔ الیکشن کرانے کے پیچھے کانگریس کی منشا جہاں کچھ اور ہے وہیں الیکشن کی مخالفت کے پیچھے حزب اختلاف کی جماعتوں کا مقصد کچھ اور ہے۔ ادھر عوام بھی انتخابات کے حق میں نہیں ہیں اور جنگجو تنظیموں نے بھی ان کے بائیکاٹ کا اعلان کر رکھا ہے۔ ایسی صورت میں کانگریس کی جانب سے الیکشن کرانے کی ضد کسی خاص سمت میں اشارہ کرتی ہے۔ نیشنل کانفرنس بھی جو کہ کانگریس کے ساتھ اتحاد کر کے وہاں حکومت کر چکی ہے، انتخابات کے خلاف ہے۔ اس کے لیڈر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا مطالبہ ہے کہ الیکشن سے پہلے کشمیر میں ۱۹۵۳ء سے پہلے کی پوزیشن بحال کی جائے۔ یاد رہے کہ ۱۹۵۳ء سے قبل کشمیر کے وزیر اعلی کو وزیر اعظم اور گورنر کو صدر ریاست کہا جاتا تھا اور دفاع، خارجہ اور مواصلات کو چھوڑ کر باقی تمام امور میں ریاستی حکومت خود مختار ہوتی تھی۔ وزیر اعظم نے یہ تو کہا کہ وہ وزیر اعلی کو وزیر اعظم اور گورنر کو صدر ریاست کہنے کے حق میں ہیں لیکن ۱۹۵۳ء سے قبل کی دیگر شرائط پر انہوں نے کوئی مثبت رد عمل ظاہر نہیں کیا۔

فاروق عبداللہ کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق غیر متنازعہ ہے لیکن تب تک انتخابات کی بات بیکار ہے جب تک کہ کشمیر میں ۱۹۵۳ء سے قبل کی پوزیشن بحال کر کے اسے عظیم خود مختاری نہیں دے دی جاتی۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کشمیر میں حالات الیکشن کے حق میں نہیں ہیں۔ میں الیکشن میں تو حصہ لے سکتا ہوں کیونکہ میرے پاس سینکڑوں سیکورٹی گارڈس ہیں لیکن عوام کا کیا ہوگا جو ووٹ دیتے ہی جنگجوؤں کے ذریعے مار دئے جائیں گے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ میں حالات کے بہتر ہونے تک انتظار کر سکتا ہوں خواہ اس میں سو سال لگ جائیں۔

جماعت اسلامی کے رہنما اور کل جماعتی حریت کانفرنس کے لیڈر سید علی شاہ گیلانی کا کہنا ہے کہ کشمیر کے مسئلے کا حل حق خود ارادی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے سہ فریقی گفتگو ہونی چاہئے جس میں ہندوستان، پاکستان اور کشمیری عوام شریک ہوں اور یہ گفتگو اقوام متحدہ کے زیر نگرانی ہو۔ انتخابات کو بندوق کی نوک پر الیکشن قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلح دستے عوام کو پکڑ کر لے جائیں گے اور ان سے ووٹ دلوا دیں گے لیکن یہ کوئی مستقل حل تو نہیں ہے۔ ہمیں مسئلے کا حل

وہ الیکشن جس میں ایک جماعت کے علاوہ کوئی سیاسی جماعت شریک نہیں ہوتی۔ صحیح معنوں میں الیکشن نہیں، الیکشن کا ڈرامہ ہوتا اور اس ڈرامے کی آڑ میں مرکز پھر اپنا کھیل کھیلتا، پھر قتل و خوں ریزی میں اضافہ ہوتا اور وادی کشمیر کے شب و روز میں بہتری کے بجائے ابتری مزید اپنی جگہ بنا لیتی۔

اس شمارے کی قیمت پانچ روپے
سالانہ چندہ ایک سو روپے / چالیس امریکی ڈالر
یکے از مطبوعات
مسلم میڈیا ٹرسٹ
پرنٹر پبلیشر، ایڈیٹر محمد احمد سعید نے
تیج پریس بہادر شاہ ظفر مارگ سے چھپوا کر
دفتر ملی ٹائمز انٹر نیشنل
49، ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 سے شائع کیا
فون نمبر 6827018 ۔۔ 6926030
سری نگر بذریعہ ہوائی جہاز ساڑھے پانچ روپے

...کی ٹرٹراہٹ

...حالے

لیکن آخری وقت تک عوام کی طرف سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہوا۔ الیکشن سے عوام کی بیزاری کا اندازہ سری نگر کے پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ میں ملازم بشیر احمد کے اس جملے سے ہوتا ہے کہ اگر انتخاب ہو گا تو کتے بھی ووٹ ڈالنے نہیں جائیں گے۔ بھلا اپنی زندگی کون خطرے میں ڈالے گا۔ گویا کہ زیادہ تر لوگوں نے انتخاب کے خیال کی مخالفت یا تو نظام میں عدم اعتماد یا ہنگامہ اور بھگدڑ سے خائف ہو کر کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انتخابی ڈیوٹی کے لئے فہرست سازی کی مخالفت بھی سرکاری ملازمین نے بیک آواز ہو کر کی اور انہوں نے بھی انتخاب کے اعلان کے دن قلم چھوڑ ہڑتال کرکے یہ اعلان کردیا کہ ہمارا سروکار آزادی سے ہے، انتخاب سے ہمیں کچھ نہیں لینا ہے۔ ان تمام آراء سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کشمیر میں سیاسی سرگرمی کی تجدید کے دعوے کے باوجود وہاں کے عوام کو کسی مشترک مقصد پر ہم خیال بنانے میں ناکام رہی ہے۔ انہیں نہ حریت کے لیڈروں پر اور نہ ہی فاروق عبداللہ پر اعتماد ہے۔ آج بھی وہ ۱۹۸۷ء کے اسمبلی انتخابات میں وسیع پیمانے پر ہوئی دھاندلیوں کی شکایت کرتے ہیں کہ کس طرح نیشنل کانفرنس نے مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کو بے دخل کردیا۔ اس طرح مجموعی تاثر یہی ہے کہ ایک بار پھر انہیں زبردستی انتخابات کے بکھیڑے میں الجھایا جائے گا۔ (انگریزی سے تلخیص)

دہلی میں حریت کانفرنس کا دفتر

کیا حریت رہنما حکومت سے کوئی سودے بازی کرنا چاہتے ہیں؟

۱۹۹۳ء میں انتشار زدہ ریاست جموں و کشمیر میں منظر عام پر آنے والی کل جماعتی حریت کانفرنس ۲۳ جماعتوں اور گروہوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی مجلس منتظمہ کشمیر کے علاقوں میں اپنا حلقہ اثر رکھنے والی سات پارٹیوں پر مشتمل ہے۔ یہ پارٹیاں ہیں جماعت اسلامی، پیپلز کانفرنس، پیپلز لیگ، عوامی ایکشن کمیٹی، جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ، اتحاد المسلمین اور مسلم کانفرنس جن کے سربراہوں کے نام بالترتیب علی شاہ گیلانی، عبدالغنی لون، شبیر شاہ، میر واعظ عمر فاروق، محمد یاسین ملک، مولانا عباس انصاری اور عبدالغنی لون ہیں۔ کل جماعتی حریت کانفرنس کے صدر کشمیر کے میر واعظ عمر فاروق ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں علی شاہ گیلانی قائم مقام صدر ہیں۔ اس جماعت کی اچانک تشکیل اسی طرح ہوئی جیسے ۱۹۸۹ء میں "دہشت گردی" کی رفتار تیز ہوگئی۔ کل جماعتی حریت کانفرنس نے کشمیر میں انتخابات کا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ اور کشمیری عوام کو حق خود ارادیت دیئے بغیر کسی بھی انتخاب کے حق میں نہیں ہے۔ اور یاسین ملک کے علاوہ سبھی اہم کھلاڑی انتخابات میں حصہ لے چکے ہیں۔ ۶۵ سالہ سید علی شاہ گیلانی اور عبدالغنی لون طویل عرصے تک کشمیر اسمبلی کے ممبر رہے ہیں۔ موخرالذکر کی جماعت اسلامی سے وابستگی ۱۹۵۳ء سے چلی آرہی ہے۔

وہ اپنے بے داغ جمہوری اوصاف کے لئے بھی معروف ہیں۔

منتخب قانون ساز کی حیثیت دستور ہند اور ملک کی سالمیت کے تئیں حلف وفاداری لینے کے بعد جب ان کے موقف میں تبدیلی کے بارے میں ان سے دریافت کیا گیا تو گیلانی نے فوراً اپنی اس رائے کو دہرایا کہ یہ طریقہ کار جدوجہد کا ایک حصہ ہے جس سے کہ کشمیری عوام کے لئے حق خود ارادیت کے حصول کو یقینی بنایا جاسکے۔ گیلانی کا خیال ہے کہ کل جماعتی حریت کانفرنس کے دائرہ کار کو وسیع کرتے ہوئے جموں اور لداخ کے علاقوں کے

شبیر شاہ، علی شاہ گیلانی اور یاسین ملک

نمائندوں کو بھی اس میں شامل کرنا ہوگا اور جیسا کہ انہوں نے کہا "ہم ریاست کے عوام کی نمائندگی کر رہے ہیں اور ان کے حقوق کی نمائندگی بھی جو انہیں ۱۹۴۷ء کے تقسیم ملک کے المناک سانحے سے پہلے حاصل تھے۔" اہم بات یہ ہے کہ کانفرنس کے قائم مقام صدر گیلانی جو برسوں تک دو اختیاری نظریے کو مقبول بنانے کے لئے کوشاں رہے (یعنی یہ کہ کشمیر کا الحاق ہندوستان سے کیا جائے یا پاکستان سے) وہ اب تیسرے اختیار کے حق میں بھی نظر آتے ہیں اور وہ اختیار ہے جموں و کشمیر کی آزادی چاہنے کا بشرطیکہ عوام اس کی حمایت کریں۔ گیلانی کشمیری پنڈتوں کی وادی میں واپسی بھی چاہتے ہیں۔

۶۳ سالہ عبدالغنی لون ۱۹۶۷ء میں کانگریس سے کشمیر اسمبلی کے ممبر منتخب ہونے کے بعد سے چار بار اسی حیثیت میں منتخب ہوتے رہے۔ جی ایم صادق اور میر قاسم کے زمانے میں وہ جموں و کشمیر حکومت میں وزیر بھی رہے۔ کانفرنس سے بھی ان کی عارضی نسبت رہ چکی ہے اور شمالی کشمیر کے کپواڑہ ضلع میں ان کا حلقہ اثر وسیع ہے۔ اور مسئلہ کشمیر کی بین الاقوامی نزاکتوں کے بارے میں ان کا ذہن بالکل صاف ہے۔ جہاں تک فاروق عبداللہ کا تعلق ہے تو ریاست کے اندر تمام سیاسی طاقتوں کی اجتماعی کاوش سے جو بھی نظام بنے اس میں ان کی اہمیت مسلم ہے۔ ماضی قریب میں بحیثیت وزیراعلیٰ ان کے رول کے مدنظر انہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ۴۲ سالہ شبیر شاہ جن کی قید و بند کا سلسلہ چودہ سال کی عمر سے شروع ہوا جیل میں ۲۱ سال گزار چکے ہیں جس کی بناء پر انہیں کشمیر کا نیلسن منڈیلا کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی اصل پارٹی یعنی پیپلز لیگ کی وابستگی سے دستبردار ہوگئے ہیں جس کا مقصد غیر جماعتی لیڈر کی حیثیت سے ابھر کر آنا ہے۔ اسی لئے انہوں نے گذشتہ سال جیل سے رہائی کے بعد سب سے پہلے جموں اور اودھم پور میں پناہ گزیں کشمیری پنڈتوں کے کیمپ کا دورہ کیا۔ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے ۲۹ سالہ یاسین ملک ہندوستانی ذرائع ابلاغ سے بری طرح متنفر ہیں کیونکہ اس نے انہیں ہندوستانی حکومت کا ایجنٹ اور مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والا دہشت گرد قرار دیا ہے۔ کشمیر کے عوام کی آزادی کے مقصد کو فروغ دینے میں انہوں نے اپنے جنگجو ساتھیوں کو گاندھیائی خیالات کی افادیت تسلیم کرانے کی انتھک کوشش کی ہے۔ وہ کشمیر کی آزادی کے خواہاں ہیں نہ کہ دونوں ملکوں میں سے کسی کے ساتھ اس کے الحاق کے۔

میر واعظ عمر فاروق تو ابھی انیس سال کے ہی ہیں۔ کشمیری سیاست کا دامن بھی انہوں نے چھوا نہیں ہے ہر چند کہ سرینگر میں انہیں عوامی حمایت حاصل ہے۔ غرضیکہ ان پانچ اہم کھلاڑیوں میں سے عبدالغنی لون اور سید علی شاہ گیلانی آئندہ کوئی قابل ذکر رول ادا کریں گے۔

...زخموں پر مرہم رکھنے کی ضرورت

ہندوستان کو یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ کشمیر اس کا لازمی حصہ نہیں بلکہ ایک متنازعہ علاقہ ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت حل ہو سکتا ہے جب اقوام متحدہ کی نگرانی میں ریفرنڈم کروایا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہمیں آزادی چاہیئے مکمل آزادی۔ ہندوستان سے بھی اور پاکستان سے بھی۔"

چاہیئے اور حل یہی ہے کہ آپ عوام سے پوچھئے کہ تمہیں کیا چاہیئے۔ مسئلہ کشمیر کو نہ تو ہماری بندوقیں حل کر سکتی ہیں نہ ہی سیکورٹی دستے۔ البتہ ہم اپنی جنگ جاری رکھیں گے کیونکہ ہمارے لئے یہی ایک چارہ بچا ہے۔

جے کے ایل ایف کے لیڈر یاسین ملک کہتے ہیں کہ ہم کسی بھی کشمیری کو ووٹ ڈالنے نہیں دیں گے۔ پچاس ہزار کشمیری اپنی جانوں کا نذرانہ دے چکے ہیں ہم نے اپنے لوگ، اپنی عزت اور اپنی جائدادوں کو اس لئے نہیں گنوایا ہے کہ ہم ہندوستان کے تحت ہونے والے الیکشن میں حصہ لیں۔ ان کا کہنا ہے کہ

کشمیری تنظیمیں جہاں حق خود ارادی کے تحت انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کرتی ہیں وہیں ہندوستانی سیاسی جماعتیں دوسری وجوہات سے الیکشن کی مخالفت کرتی ہیں۔ سابق مرکزی وزیر خارجہ آئی کے گجرال کہتے ہیں کہ ہمیں پہلے کشمیری عوام کے ساتھ گفتگو اور تبادلہ خیال کرنا چاہیئے۔ ضد سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، یہاں تک کہ اسرائیل نے بھی پچاس سال کے بعد یہ سبق سیکھ لیا اور گفتگو پر آمادہ ہوگیا۔ گفت و شنید کے ذریعے نئی زبان وجود میں آتی ہے۔ لہٰذا پہلے گفتگو کے ذریعے کشمیری عوام کے دل جیتنے چاہئیں اس کے بعد الیکشن کی بات کرنی چاہیئے۔ جنتا دل کے لیڈر اور کشمیری رہنما سابق وزیر داخلہ مفتی سعید کا کہنا ہے کہ انتخابات کا خیر مقدم کرنا چاہیئے لیکن ایسے الیکشن سے جس میں محض دس پانچ فیصد لوگ ہی حصہ لیں کیا فائدہ ہوگا۔ ایسے الیکشن سے حالات کے اور خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ وزیراعظم چاہتے ہیں کہ ادھر ادھر کرکے وہاں ایک حکومت بٹھادی جائے۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسے ہی تین انتخابات کا خمیازہ ہم آج بھگت رہے ہیں۔ بائیں بازو کے لیڈروں کا بھی یہی خیال ہے کہ جب انتخابی عمل میں کوئی حصہ ہی نہیں لے گا تو ایسے انتخابات سے کیا فائدہ ہوگا۔ کشمیر پنجاب نہیں ہے کہ آپ نے الیکشن کروا کر دہشت گردی کا خاتمہ کروادیا۔ دونوں ریاستوں میں بہت فرق ہے اور دونوں کو ایک پلڑے میں رکھنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیئے۔

بہرحال کوئی بھی سیاسی جماعت کشمیر میں اس وقت انتخابات کے حق میں نہیں ہے۔ کیونکہ حالات کسی بھی طرح الیکشن کے حق میں نہیں ہیں۔ حکومت کو چاہیئے کہ پہلے کشمیری عوام کے مسائل کو سمجھے، ان کے دکھ درد پر مرہم رکھنے کی کوشش کرے۔ پہلے کی مانند دہلی سے حکمراں تھوپنے کی حماقت نہ کرے، مسلح دستوں کی زیادتیوں پر پابندی لگادے اور عوام کو ساتھ لے کر چلنے کا رویہ اپنائے، پھر انتخابات کی بات کرے ساتھ ہی جنگجو تنظیموں کو بھی چاہیئے کہ وہ بے قصور افراد کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی سے گریز کریں، اسے کسی بھی طرح اسلامی عمل نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اقوام متحدہ کی پابندیوں کے نتیجے میں ماہرین آثار قدیمہ بے روزگار

قدیم نوادرات سے مالامال عراقی آثار قدیمہ کی تباہی

تہذیب کے مبدء آغاز اور قدیم نوادر سے مالامال ممالک میں شمار ہونے والے ملک عراق کے ماہرین آثار قدیمہ نے اقوام متحدہ کی طرف سے پانچ سال قبل عائد کردہ پابندیوں کی بناء پر اپنی سرگرمیوں کا دائرہ کار بہت محدود کردیا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ غیر ملکی سفارت خانے عراق چھوڑ کر جاچکے ہیں۔ بعض عراقی ماہرین آثار قدیمہ نے زیادہ پرکشش روزگار کی تلاش میں اپنے سابق پیشے کو خیر باد کہہ دیا ہے اور بغداد کے محکمہ آثار قدیمہ کے لئے اپنے منصوبوں کو پوری طرح چلانے کی خاطر مالی وسائل کمیاب ہوگئے ہیں۔ اس دوران اسمگلر اور غیر قانونی تحفیر کار یعنی کھدائی کرنے والے حکومت کی اس کمزوری سے فائدے اٹھاکر نوادر کے لئے ہمیشہ منہ پھاڑے رکھنے والے بازاروں میں بیش قیمت نوادر سپلائی کررہے ہیں۔

بشمول بغداد میوزیم آثار قدیمہ کے تمام میوزیم عوام کے لئے بند کردئے گئے ہیں۔ ان میں رکھے گئے اہم دستاویز اور اشیاء جوہری اس خوف سے آہنی الماریوں میں بند کردئے گئے ہیں کہ کسی بھی وقت عراق پر بمباری کا فیصلہ اقوام متحدہ کرسکتی ہے۔ اب تاریخی اہمیت کے مقام پر زائرین بھی بہت کم آتے ہیں جس سے محکمہ آثار قدیمہ کی آمدنی متاثر ہوتی ہے اور اس کی اسے شدید ضرورت ہے۔ اس محکمے کے ڈائرکٹر کے ایک بیان کے مطابق ہر سال انہیں خاصی رقم مل جاتی تھی اور اب افراط زر کی بناء پر محکمہ کو ہونے والی آمدنی بہت کم ہوگئی ہے۔ اجرتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ محکمے کی پوری آمدنی اسی کی نذر ہوجاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایسے میں ہمیں عراق میں برسر روزگار غیر ملکی ماہرین آثار قدیمہ کی خدمات کی اشد ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے غیر ملکی ماہرین آثار قدیمہ کی خدمات لی جاتی ہیں لیکن ان کے منہ سے کلمہ خیر سننے کے علاوہ ابھی کچھ نہیں ہوپایا ہے کیونکہ ان کی حکومتیں کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گی۔

> حالت یہ ہے کہ غیر ملکی سفارت خانے عراق چھوڑ کر جاچکے ہیں۔ بعض عراقی ماہرین آثار قدیمہ نے زیادہ پرکشش روزگار کی تلاش میں اپنے سابق پیشے کو خیر باد کہہ دیا ہے اور بغداد کے محکمہ آثار قدیمہ کے لئے اپنے منصوبوں کو پوری طرح چلانے کی خاطر مالی وسائل کمیاب ہوگئے ہیں۔

جاپان اور برطانوی ماہرین آثار قدیمہ نے عراق آنے میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ بھی اقوام متحدہ کی پابندیوں کی خلاف ورزی نہیں کرسکتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں جو خالصا اقتصادی پابندیاں عراق پر عائد کی گئی تھیں ان کو رفتہ رفتہ ثقافتی بائیکاٹ کی بھی شکل دے دی گئی۔ یہ خیال عراقی محکمہ آثار قدیمہ کے سالانہ ترجمان سمر نے ظاہر کیا جس کی ضخامت ۵۰۰ صفحات سے اب صرف ۱۲۰ صفحات پر آگئی ہے جس کا سبب کاغذ کی قلت ہے۔ نوادر کے تحفظ کے کام آنے والی مخصوص مصرف کی اشیاء کی بھی قلت ہوگئی اور اب محکمہ کے عملے کی تعداد بھی ۳۳۰ سے گھٹ کر ۲۴۰ ہوگئی ہے اور مختلف مقامات پر آمد و رفت کے لئے گاڑیوں کی تعداد میں بھی کمی آگئی ہے۔ محکمے کی طرف سے ۱۹۷۴ء میں اسمگلروں کے تصرفات پر ایک مباحثہ ہوا تھا لیکن یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل پر اس کی قراردادوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ ایک اطلاع کے مطابق عراقی کردستان میں مشکوک یوروپین افراد آآکر وہاں کھدائی کرتے رہے اور یہ ایسا علاقہ ہے جو بغداد کی حکومت کے اختیار سے باہر ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر کا بیان ہے کہ کردستان میں آثار قدیمہ کا عملہ ان غیر قانونی مداخلت کاروں تک رسائی اس لئے نہیں پاسکتا کہ مداخلت کاروں کو دہشت گرد گروہ کی حمایت حاصل ہے۔ کردستان میں اسیری اور قبل از تاریخ کے زمانے کے اہم مقامات ہیں جن میں بالائی دریائے زاب کے کنارے واقع "شاندار غار ہے جو ۴۵۰۰۰ سال پہلے کے انسان کا مسکن تھا۔ مذکورہ مباحثے میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قدیم نوادرات کے سیکڑوں لٹیروں نے امہ کے مقام پر کھدائی کرکے ایک قدیم یادگار نکال لی۔ شمالی عراق میں ہاٹرا اور نمرود میں بھی یہی ہوا اور قیمتی مجسمے اور آرٹ کے نمونے چوری سے فروخت کردئے گئے۔

اقوام متحدہ کی پابندیوں کے نیچے دبے ہوئے عراقی محکمہ آثار قدیمہ کو اب اپنا اصل کام چھوڑ کر بند اور آب پاشی کی نہریں تعمیر کرنا پڑ رہی ہیں اور اس مقصد سے بلد میں کھدائی کا کام جاری ہے جو اس وقت اہم اسلامی شہر رہا ہے جب دنیائے عرب بھی بغداد کے زیر نگیں تھی۔

کردستان کا خواب دیکھتے دیکھتے کرد آپس ھی میں لڑنے لگے

کردوں کا ایک ایسی خود مختار ریاست کا خواب جس کی سرحدیں عراق، ترکی، ایران اور شام کو چھوئیں گی خلیجی جنگ کے بعد تعبیر کی منزل کے قریب ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔ کم از کم شمالی عراق میں جہاں امریکی برطانوی اور

فرانسیسی طیارے صدام حسین کے فوجیوں کو محفوظ خطے سے دور رکھنے میں کوشاں ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کردوں کے دشمن خود ان کے ہی اندر کے لوگ ہیں۔ ایک سال سے زائد عرصے سے دو جنگجو گروہ کرد ڈیموکریٹک پارٹی اور پیٹریاٹک یونین آف کردستان بالترتیب مسعود برزانی اور جلال طالبانی کی قیادت میں ایک دوسرے کے خلاف شمالی عراق میں صف آرا ہیں اور گذشتہ اگست میں ترکی کی کردور کرز پارٹی بھی اس اکھاڑے میں کود پڑی اور اس برادر کشی میں موخر الذکر کو بالادستی حاصل رہی۔

خلیجی جنگ کے خاتمہ کے بعد سے کردور کرز پارٹی شمالی عراق کی اس محفوظ جنت کو تربیت گاہ اور سرحدی حملوں کو جنوب مشرقی ترکی تک لے جانے کے لئے اسپرنگ بورڈ کے طور پر استعمال کرتا رہا ہے اور اس کے پندرہ ہزار میں سے تین ہزار گوریلا محفوظ خطے میں منتقل ہوچکے ہیں۔ برزانی کے اشارے پر شمالی عراق میں مداخلت کا مقصد سرحدی مورچہ بندی کو وسعت دینا تھا۔ برزانی کی ترکی نوازی کا سبب یہ ہے کہ ترکی عراق کو ملانے والی شاہراہ کی وجہ سے کردوں کے لئے رگ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ پی کے کے کا دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ برزانی کے حریف طالبانی کو اپنی طرف کرلے۔ لیکن ہوا یہ کہ طالبانی کا گروہ حاشیے پر ٹکا رہا اور پی کے کے کی یورش ناکام ہوگئی اور اس کی آرزوؤں پر پانی پھر گیا۔ برزانی کے آدمی آج بھی پی کے کے ۱۵۰۰ دراندازوں کے تعاقب میں ہیں جو ایرانی سرحدوں کی طرف جانکلے ہیں۔ دونوں کے درمیان تصادمات کے نتیجے میں برزانی کے ذرائع کے مطابق ایک ہزار پی کے کے جنگجو ہلاک ہوئے ہیں اور آزادی کے لئے اس ایک سال کی جدوجہد کے دوران شاید اسے پی کے کے کی سب سے بڑی شکست سے تعبیر کیا جائے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس شکست کا منہ انہیں ترکی کی فوجیوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ خود اپنے بھائیوں یعنی کردوں ہی کی وجہ سے دیکھنا پڑ رہا ہے۔ اس شکست کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ پی کے کے کی فوج زیادہ تر کردستانی قریوں کے لوگوں یا اغوا کئے گئے نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ واضح رہے کہ یہ قریے وہی ہیں جن کا ترکی فوجوں نے جنوب مشرقی حصے میں محاصرہ کر رکھا ہے۔ ان کے برعکس برزانی کے فوجیوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو عمر رسیدہ اور تجربہ کار ہیں اور عراقی فوج کے خلاف لڑ بھی چکے ہیں۔

شمالی عراق میں فوجی کارروائیوں کے ایک ٹھکانے کا ہاتھ سے نکل جانا پی کے کے کے لئے یقینا ایک بڑا نقصان ہے۔ یہ وہی پہاڑی علاقہ ہے جس کا پتہ صدام حسین نے لگایا تھا اور جو گوریلا جنگ کا اہم مرکز بنا رہا ہے۔ عراقی فوجیں کردوں کے حملے کے آگے یہاں تک نہ سکیں ہرچند کہ ایک کارروائی میں تقریبا ۴۵۰۰ قریوں کو تہس نہس کردیا گیا تھا۔ یہی سبق ترکوں کو بھی ملا۔ گذشتہ مارچ میں ترکی نے اپنے چالیس ہزار فوجی سرحد کے پار اتارے تاکہ پی کے کے سے شمالی عراق کو پاک کرسکے۔ غیر ملکی مشاہدین کا کہنا ہے کہ ترکی فوج مشکل سے پی کے کے تیس جنگجو مار پائی ہوگی۔ برسوں تک عراقی کردوں کی پناہ گاہ بنی ہوئی پہاڑیوں میں یہ جنگجو چھلاوے کی طرح غائب ہوجاتے ہیں اور کسی کے ہاتھ نہ آتے۔ گویا کہ یہ کارروائی پوری طرح ناکام ثابت ہوئی۔ کردوں کو اس نبرد آزمائی کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ پی کے کے اب ترکی کے سیاسی استحکام کے لئے سنگین خطرہ نہیں رہ گئی ہے کیونکہ اس کی شکست نے ترکی سے لڑنے کے قابل چھوڑا نہیں ہے۔

●

بقیہ: بچے بڑے نمازیوں کے ساتھ

دیں گے۔؟

جواب: ــــ اسلام میں چچا زاد بھائی بہنوں کا تصور نہیں ہے۔ صرف ہندوستانی سیاق میں ہی اس اصطلاح کا اطلاق سگے چچا کے لڑکے لڑکیوں پر ہوتا ہے۔ اسلام میں ان کی حیثیت نامحرموں کی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی شخص کو اپنی چچازاد بہن سے خلوت سے اسی طرح احتراز کرنا چاہئے جیسے کہ کسی دوسری عورت کے ساتھ۔ اس لئے جب آپ اپنی چچازاد بہن کے یہاں جائیں اور اس کا شوہر گھر پر نہ ہو تو وہاں ٹھہرنا نہیں چاہئے۔ ظاہر ہے کہ آپ دونوں کی تھوڑی دیر کے لئے یکجائی بھی اچھی نہیں ہے۔

بعض عم زادوں میں حد درجہ قربت اس بناء پر ہوسکتی ہے کہ وہ ایک ہی گھر میں پلے بڑھے ہوں یا یہ کہ وہ ہم عمر ہیں اور ایک ساتھ کھیلتے کودتے ہیں اور اس بناء پر بھی ایک دوسرے کے یہاں ان کی برابر آمد و رفت رہتی ہے۔ لیکن اس قربت کے نتیجے میں یہ نہیں ہونا چاہئے کہ کوئی عورت یا لڑکی اپنے چچا کے لڑکے کے سامنے ایسے حلیے میں آئے یا اس طرح اس کا استقبال جو اس کے لئے جائز نہ ہو۔ جب ایسی کسی حد سے تجاوز کوئی کرنے لگتا ہے تبھی لوگ کانا پھوسی کرتے ہیں۔ اگرچہ صحیح صورت حال جانے بغیر لوگوں کو انگلی نہیں اٹھانی چاہئے لیکن یہ ذمہ داری ہر دو حضرات پر عائد ہوتی ہے کہ انگلی اٹھنے کی نوبت نہ آنے دیں۔ دونوں عم زاد اور عورت کا شوہر اگر اسلامی اصول پر قائم رہتے تو کوئی طرح طرح کی باتیں نہ بناتا۔

●

کین سارو ویوا کی پھانسی سے عوامی غم و غصہ کا طوفان

نائجیریا کی فوجی حکومت کے پاؤں اکھڑ جائیں گے؟

اوائل نومبر کی ایک صبح سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ نائجیریا کے صف اول کے ادیب کین سارو ویوا اور ان کے نو ساتھیوں کی زندگی کا سورج حکومت کے ہاتھوں غروب کردیا گیا۔ کین جو ایک ماحولیاتی مجاہد بھی تھے انہیں اور ان کے اوگونی قبیلے سے تعلق رکھنے والے آٹھ انقلابی ساتھیوں کو پورٹ ہارٹ کورٹ کے نواح میں واقع بوری فوجی کیمپ سے باہر لاکر صدر جیل میں پھانسی پر لٹکایا گیا اور آنا فانا ہارٹ کورٹ کے قبرستان میں دفن بھی کردیا گیا۔ اس سے دس روز پہلے ہی ان کے ایک قتل میں ملوث ہونے کے مقدمے کی سماعت ہوئی تھی۔ نائجیریا کی تاریخ میں یہ سریع ترین عدالتی فیصلہ کہا جائے گا اور غالبا نائجیریا کے لئے مہلک ترین بھی۔ دنیا بھر کے لیڈروں کی طرف سے رحم کی سفارش سے امید بندھی تھی کہ نائجیریا کے طاقتور فوجی حکمراں ثانی اباشا انہیں کو رہا کردیں گے لیکن پھانسی چڑھانے کے عاجلانہ اقدام نے نائجیریا کو فوجی آمروں کی طویل فہرست میں پہلے مقام پر لاکھڑا کیا ہے جہاں ہر حکمراں ۱۹۶۰ء سے جمہوریت لانے کا وعدہ تو کرتا رہا ہے لیکن عوام کی رسائی اس جمہوریت تک آج بھی نہیں ہوپائی ہے۔

دنیا کے سبھی امن پسند حلقوں اور شخصیتوں نے اباشا کے اس عمل کی شدید مذمت کی ہے۔ تقریبا چھ ملکوں نے نائجیریا سے
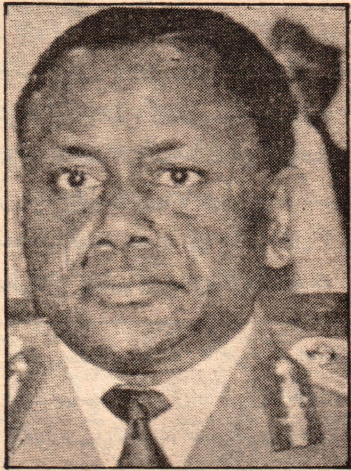
ثانی اباشا

اپنے سفیروں کو واپس بلالیا ہے۔ دولت مشترکہ کے ممبروں پر مشتمل ۵۲ رکنی تنظیم نے اپنے آک لینڈ (نیوزی لینڈ) میں منعقد اجلاس میں نائجیریا کو اپنی تنظیم سے معطل کردیا اور جمہوریت کی طرف پیش قدمی میں اس کی ناکامی کی صورت میں تنظیم سے اخراج کی دھمکی دی ہے۔ عالمی بینک نے سیال قدرتی گیس کا سو ملین ڈالر کا ایک اہم پروجیکٹ کالعدم کردیا۔ اس بربریت پر اگر کسی کا دل نہیں پگھلا تو وہ تھے نائجیریا کے حکمراں۔ اقوام متحدہ میں نائجیریا کے قائم مقام نمائندے نے مغربی حکومتوں کی ان الفاظ میں سرزنش کی کہ "یہ ہمارے داخلی معاملات میں کھلی ہوئی مداخلت ہے" وزیر خارجہ ٹام اکیمی نے دولت مشترکہ کے اجلاس میں دعوی کیا کہ کین ایک شخص کے سفاکانہ قتل میں ملوث تھا جب کہ پوری دنیا کی نظروں میں کین ایک بڑے ادیب اور غیر متشدد نظام مخالف تھے۔ وہ "موومنٹ فار سروائیول آف دی اوگونی پیپل" کے بانی تھے۔ اس علاقے کی ترقی اور خوشحالی کی طرف حکمرانوں کو متوجہ کرنے کے لئے انہوں نے احتجاج بھی کیا تھا۔ انہوں نے پچاس ہزار نفوس پر مشتمل ۳۵۰ مربع میل کے اس علاقے کے قیمتی تیل کے میدانوں میں ماحولیاتی آلودگی اور تباہ کاریوں کے خلاف تحریک بھی چلائی تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اس علاقے سے ہونے والی آمدنی کا بڑا حصہ اوگونی افراد پر ہی خرچ ہو اور اسی لئے انہیں اباشا حکومت کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔

ہوا یوں کہ مارچ ۱۹۹۳ء میں رائل ڈچ شیل کمپنی نے جو کین کا اصل نشانہ تھا پائپ لائنوں کی چوری ہوجانے کی وجہ سے اوگنی لینڈ کو خیرباد کہا اور اس سے نائجیریائی حکومت کو یومیہ ۲۵۰۰۰۰ ڈالر کا نقصان ہوا۔ ہرچند کہ کین نے کوئی تشدد اختیار نہیں کیا لیکن حکمراں طبقہ نے ان کا صفایا کرنے کی ٹھان لی۔ اسی دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ کین کے حامیوں نے حکومت نواز سرداروں کو مار ڈالا اور کین پر اس قتل پر اپنے ساتھیوں کو اکسانے کا الزام لگایا گیا۔ مقدمہ چلا اور معلوم ہوا کہ الزام بے بنیاد تھا اور بہت سے گواہوں کو خریدا گیا تھا۔ کین کا قتل اباشا حکومت کی بڑھتی ہوئی عدم تحفظ کی ذہنیت کا غماز بھی ہے جس کا اندازہ صدارتی محل میں ان کی گوشہ نشینی اور کبھی باہر نکلنے پر مسلح پاسبانی سے ہوتا ہے۔ گذشتہ ماہ ایک انقلاب کی سازش میں ملوث پندرہ فوجی افسران کی سزائے موت انہوں نے معاف کردی تھی اور اس لچکدار

کین سارو ویوا

موقف کے خلاف "پروژنل رولنگ کونسل" کے شدت پسند ممبران نے احتجاج کیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ کیا اباشا کی اکڑ کسی طرح نکالی جاسکتی ہے۔ امریکہ اقوام متحدہ پر زور ڈال رہا ہے کہ نائجیریا پر اقتصادی پابندیاں عائد کی جائیں جس میں اسلحہ کی فروخت پر پابندی بھی شامل ہے۔ صدر کلنٹن نے ویزا کی پابندی میں توسیع کردی ہے لیکن ایسا ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ امریکی حکومت نائجیریا کے خام تیل کے عالمی بائیکاٹ کی حمایت کرے گی۔ جس پر ملک کی ۹۰ فیصد برآمدی آمدنی کا انحصار ہے۔

اگر کسی کو موت کی قیمت کا احساس تھا تو خود کین کو۔ ہارٹ کورٹ میں اپنی قید گاہ سے انگریزی رسالہ "نیوز ویک" کو انہوں گذشتہ مئی میں لکھا تھا کہ "میں پھانسی پر چڑھنے سے نہیں ڈرتا۔ جن لوگوں سے ہمارا واسطہ ہے وہ پتھر کے زمانے کے ڈکٹیٹر ہیں، ان کے پاس سوچنے کی صلاحیت نہیں ہے اور خون ان کے منہ کو لگ چکا ہے۔" کین کے والدین، بھائی بہن، دوست اور پڑوسی سب اس کے انجام پر ماتم کناں تھے جیسے کہ کسی کو اس کا یقین نہ آرہا ہو۔ کین کے ایک وکیل فیمی قلانا نے اس خیال کا اظہار کیا کہ "کین کا قتل نائجیریا کے ہر فرد کے لئے ایک انتباہ بھی ہے اور چیلنج بھی۔ انتباہ اس لئے کہ کل کسی کی بھی باری آسکتی ہے اور چیلنج اس لئے کہ احتجاج کے قدامت پرستانہ طریقہ کو پھر سے پرکھنے کی ضرورت ہے۔" شاید فیمی کی یہ بات درست نکلے کیونکہ اس سے پہلے کہ لوگ کین کی آزمائش کو بھول جائیں نائجیریا کو کہیں زیادہ تشدد کا سامنا ہوسکتا ہے۔

بقیہ :— مسلمانوں کی آبادی کم ہوجائے گی

اور آمدنی کی بنیاد پر مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے خاندانوں میں پیدائش کی اوسط تعداد نکالی گئی تھی۔

سروے سے معلوم ہوا کہ ناخواندہ ہندو عورتوں میں فی کس ۷ بچوں کی اوسط تعداد ۳،۰۳ جب کہ اسی زمرہ کی مسلم عورتوں میں یہ اوسط تعداد ۳،۰۲ تھی۔ تعلیم کے فروغ کے ساتھ اس اوسط تعداد میں کمی واقع ہوئی۔ پرائمری سطح پر تعلیم یافتہ ہندو عورتوں میں یہ تعداد ۳،۱۶ اور مسلم عورتوں میں ۳،۰۵ ہوئی۔ تعلیم کی سطح بلند ہونے کے ساتھ یعنی ثانوی کی سطح پر یہ تعداد ہندو عورتوں میں ۲،۳۳ اور مسلم عورتوں میں ۲،۰۱ پائی گئی۔

آمدنی کی سطح کا بھی پیدائش کی اوسط تعداد پر اثر پڑتا ہے۔ ۵۰۰ روپے سے کم آمدنی والے ہندو خاندانوں میں یہ اوسط تعداد ۳،۲۰ اور مسلم خاندانوں میں ۳،۴۲ تھی جب کہ پندرہ سو روپے سے زائد آمدنی رکھنے والے ہندو اور مسلم خاندانوں میں یہ تعداد گھٹ کر بالترتیب ۲،۶۵ اور ۳،۲۱ رہ گئی۔

آپریشنز ریسرچ گروپ کے سروے میں ایک دلچسپ انکشاف یہ بھی ہوا کہ مسلم عورتیں ضبط تولید کی داخلی تدابیر (IUD) روایتی مانع حمل ادویات اور گولیوں کے استعمال میں ہندو عورتوں پر سبقت لے گئیں۔

۱۹۹۰ء کے سروے کے وقت مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۰،۶ فیصد تھا اور ۱۶،۸ فیصد مسلمان عورتیں مانع حمل گولیوں کے استعمال پر کاربند پائی گئیں۔ آبادی کا مطالعہ کرنے والے ماہرین کی نظر میں یہ بات بڑی اہمیت اس لئے رکھتی ہے کہ مانع حمل تدابیر اختیار کرنے والی مسلم عورتوں کا تناسب ملک کی کل آبادی میں پورے فرقے کے تناسب سے زیادہ ہے۔ اس کے مقابل ہندو آبادی ۸۵،۲ فیصد ہے لیکن سروے سے پتہ چلا کہ ۸۰،۱ فیصد ہندو عورتیں مانع حمل گولیاں استعمال کرتی ہیں۔ آئی یو ڈی کا استعمال بھی مسلم عورتوں میں نسبتا زیادہ ہے اور مسلم اور ہندو دونوں فرقوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا یہ طریقہ اختیار کرنے والی عورتوں کا تناسب ۱۰،۱ اور ۸۰،۷ رہا ہے۔ مسلم خواتین میں اس طریقے کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ اس کو وہ اپنے شوہروں کے علم میں لائے بغیر بھی برت سکتی ہیں۔

گذشتہ دو دہائیوں میں خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء تک ۲۲ فیصد ہندو اور ۱۴ فیصد مسلم عورتوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اختیار کئے۔ ۱۹۸۰ء-۸۸ء کے دوران اس طریقے کو اپنانے والی ہندو اور مسلم عورتوں میں علی الترتیب دس اور گیارہ فیصد کا اضافہ ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ضبط تولید کے طریقوں پر ہندو اور مسلم فرقوں کے زوجین کے مابین ترسیل کی سطح میں بالترتیب سولہ اور بیس فیصد کا اضافہ ہوا۔

ماہرین نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ مردم شماری کے اعداد و شمار کئی عوامل سے متاثر ہوسکتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے تارکین وطن کی موجودگی کی بناء پر بھی مردم شماری کے دوران پیش نگاری اور کوتاہ نگاری کا احتمال رہتا ہے مثال کے طور پر اروناچل پردیش کی ہندو آبادی میں ۳،۳۴ فیصد اور مسلم آبادی میں ۱۳۵ فیصد کا اضافہ تارکین وطن کی موجودگی کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی طرح اتر پردیش اور مغربی بنگال بھی تارکین وطن کی پٹی میں آتے ہیں اور ان دونوں صوبوں کی مسلم آبادی میں اضافے کے ضمن میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے۔ اتر پردیش میں مسلم آبادی میں ۳۶،۵۴ فیصد اضافہ ہے جو قومی اوسط سے تقریبا چار فیصد زیادہ ہے اور مغربی بنگال میں بھی مسلم آبادی میں ۳۶،۸۹ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔

بقیہ : اقتدار کی بھوکی بی جے پی

لئے ضروری ہے کہ پارٹی کو آڈوانی کی یاترائی اور ہندوتو وادی امیج کے حصار سے نکال لیا جائے۔

بہرحال بی جے پی نے مرکزی اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے چھلانگ لگادی ہے اور اس کے لئے اس نے اپنے ورکرس کو پوری طرح تیار ہوجانے کا حکم دے دیا ہے۔ اس اجلاس نے یہ ثابت کردیا کہ بی جے پی اس قدر اقتدار کی بھوکی ہے کہ اس کے لئے وہ اپنے اصولوں تک کا سودا کرسکتی ہے۔ ورنہ ہندوتو کے دامن کو چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ جب تک ہندوتو سے اسے سیاسی فائدہ پہنچا تب تک اس نے اس کا جھنڈا اٹھائے رکھا اور اب جبکہ وہ بے اثر ہوگیا ہے تو اسے ہندوتو کی نہیں دوسرے ایشوز کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

●

بقیہ : سعودی دارالحکومت

دھماکہ اس قبیل کی دہشت گردی کا نقطہ آغاز ہے البتہ اس بات کے واضح اشارے ملتے ہیں کہ ان دھماکوں میں ریاض میں مقیم مغربی ایجنسیوں اور سفارت کاروں کا ہاتھ ہے گو کہ وہ اس طرح مدد اور تعاون کے نام پر سعودی عرب کی خارجہ پالیسی کو خرید کر اپنے حق میں موڑنا چاہتی ہیں۔

جن تنظیموں نے ان دھماکوں کی ذمہ داری قبول کی ہے وہ گمنام ہیں۔ انہیں عوامی تائید حاصل نہیں اور نہ ہی علماء کے گروپ نے اس واقعہ سے اپنا کوئی تعلق بتایا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے واقعات کے پیش نظر سیاسی مخالفین باہمی تبادلہ خیال کے ذریعہ اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کریں تاکہ مغرب کی اسلام دشمن قوتوں کو مسلمانوں کے باہمی نزاع سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے۔

بقیہ : ملیشیا میں سیاسی انقلاب

کہ انور بتدریج پارٹی پر اپنی گرفت مضبوط کرلیں۔ ہوگا یہ کہ انور مہاتر کے خلاف انتخاب لڑنے کے بجائے انہیں جیتنے میں مدد دیں گے۔ اس کے بعد مہاتر یہ کہہ کر استعفی دے دیں گے کہ وہ اپنی اننگ کھیل چکے اور وزارت عظمی کا عہدہ انور ابراہیم کو سونپنا چاہتے ہیں۔ زیادہ تر مبصرین اب اسی امکان پر زور دے رہے ہیں کیونکہ اس باوقار طریقے سے اقتدار کی تبدیلی سے ملکی معیشت و سیاست پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑے گا۔

کیا واقعی وہ ڈائن تھی؟

بہار میں اکثر و بیشتر غریب اور بیوہ خواتین کو ڈائن کہہ کر زدوکوب کیا جاتا ہے اور ان سے مردہ انسانوں کو زندہ کرنے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ فرمائش کی عدم تکمیل میں ان مظلوم عورتوں کو غیر انسانی سلوک کی چکی میں پیسا جاتا ہے اور ان پر اتنے مظالم توڑے جاتے ہیں کہ ان کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔

ڈائن کے سلسلے کی ایک حالیہ کڑی ہے لیلا دیوی کا سانحہ۔ پچیس سالہ لیلا دیوی جو دو بچوں کی ماں ہے۔ سلیم پور تھانہ بنگرا تاج پور بلاک کا رام جی متو ولد منتو مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۹۵ء کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ لیلا دیوی کے گھر میں گھس گیا اور کہنے لگا کہ میرے نواسے کو تم نے جادو سے مار دیا ہے اسے زندہ کرو۔ لیلا دیوی نے جب یہ کہہ کر جانے سے انکار کیا کہ ان سے یہ کیا کہا ہے، اس پر وہ لوگ گالی گلوج دیتے ہوئے بزور طاقت اسے کھینچ کر مارتے پیٹتے اپنے گھر لے گئے جہاں بار بار لیلا دیوی سے اس بیس یوم کا نوزائیدہ بچہ جو مر گیا تھا زندہ کرنے کے لئے کہا گیا اور لیلا دیوی کے عضو عضو کو طرح طرح سے اذیت دینے سے بھی جب ان اوہام پرستوں کا کلیجہ نہیں ٹھنڈا ہوا تو اس نے لیلا دیوی کے کپڑے بدن سے نوچ دئے۔ بال کی لٹیں کاٹ ڈالی گئیں اور پھر پٹائی کا لمبا سلسلہ چلا جب لیلا دیوی نڈھال ہونے لگی تو انسانی بول و براز کا محلول بنا کر اسے زبردستی پلا دیا گیا اور جب زمین پر گر کر وہ بالکل ساکت ہو گئی تو ظالموں نے مردہ سمجھ کر قریب کے بانسواڑی کی جھاڑی میں پھینک دیا۔ ادھر لیلا کا غریب خاوند جو کلکتہ سے کچھ دن قبل آیا تھا پہلے تو اس نے قریب کے کئی لوگوں کے قریب گڑگڑایا مگر کوئی جب اس کی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا تو قریبی بنگرا تھانہ پہنچا جہاں داروغہ صاحب نے دو سو روپے رشوت لے کر جائے وقوع کا معائنہ کیا۔ جہاں انہوں نے قریبی کو تنک سے دوچار انجکشن لگوا کر اور یہ کہہ کر کہ سمستی پور صدر ہسپتال میں بھرتی کرا دی جائے گی۔ اپنا فرض نبھا دیا۔ ادھر لیلا دیوی کے شوہر اودیش متو نے لیلا کی حالت میں کوئی سدھار ہوتے نہیں دیکھا تو کچھ لوگوں کے مشورے سے سمستی پور کے ڈاکٹر ایس کے چودھری کے پرائیویٹ کلینک میں بھرتی کرایا جہاں ایک دن کے بعد لیلا دیوی کو ہوش آیا۔ اتنے خطرناک معاملے میں محض اوہام کی بنیاد پر ایک غریب خاتون کو اس حد تک زدوکوب کردینے کے بعد بھی پولیس والوں کا رول اس ضمن میں مشکوک ہی نہیں بلکہ سیدھے لیلا دیوی پر مظالم توڑنے والوں کے حق میں جاتا ہے۔ بنگرا تھانہ کے ذریعے مقدمہ درج نہیں کئے جانے پر اودیش متو نے مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۹۵ء کو سی جے ایم کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔ مندرجہ بالا حادثہ پر اپنی تلخی نکتہ چینی کرتے ہوئے ہریجن آدی واسی وکاس منچ کے صدر ڈاکٹر بندیشور رام نے پولیس انتظامیہ و ضلع انتظامیہ کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے کہا ہے کہ مظلوموں کو موجودہ انتظامیہ انصاف دلانے میں پوری طرح قاصر ہے۔ بھاکپا مالے کے لیڈر کامریڈ تلاش نے ایسے جملہ سماجی طور پر ہونے والے جرائم کو غربت و جہالت کے کوکھ سے جنم لینے والا اندھیرا سے تعبیر کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کو ہی سرے سے قصوروار ٹھہرایا ہے۔

کوثر بھگوت پوری، سمستی پور (بہار)

لیلا دیوی

کچھ مشورے

پورے ملک میں ہندی دوس منایا جاتا ہے اس ہندی کے لئے چالیس سال سے بیساکھی ہوئی ہے۔ ملک میں اردو دوس منایا جانا چاہیے۔

آج کل اردو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اسکول میں نہیں۔ اردو کے لئے بھی ماحول بنایا جانا چاہیے۔

جو مسلمان صاحب حیثیت ہیں وہ کسی بھی ایک مسلمان بچے کی تعلیم کا ذمہ لے لیں یا کم از کم پانچ اسکالر شپ مسلم بچوں کے لئے شروع کریں۔

جو بھی رئیس آدمی حج کو جائے وہ ایک مسلمان بچے کی تعلیم کا ذمہ لے۔

درگاہوں کی پچاس فیصدی آمدنی مسلمانوں کی تعلیم پر خرچ کی جائے۔

تعلیم بالغان کی مانند دینی اداروں میں اردو کی تعلیم بھی دی جائے۔

جن شہروں کے تاریخی نام اردو زبان میں ہوں ان کے نام بدلنے کی کارروائی بند ہونی چاہیے۔

حکومت ہند کو اس کا احساس دلایا جائے۔

مسلمان بذات خود اپنا کوآپریٹیو بینک بنائیں اور ضرورت مند اشخاص کی مالی امداد کریں۔

ڈاکٹر کے۔ بی۔ غازی

گوری نگر وارڈ نمبر ۱۲ راجنا ند گاؤں (ایم پی)

ایک درگاہ سازش کی شکار

بابری مسجد کی شہادت اور عید گاہ پیر بٹاون کے سانحہ کے بعد سے حساس ضلع بارہ بنکی کے سماج دشمن عناصر کے حوصلے اس قدر بلند ہو گئے ہیں کہ وہ پولیس اور انتظامیہ کے حکام کو زندہ مکھی نگلنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں جس کی تازہ مثال درگاہ شاہ عبدالرحمن و پیرن تالاب وغیرہ واقع موضع پنھل (نزد ٹکرہ بوجہ) ہے جو کہ سالہائے قدیم سے نہ صرف یہ کہ سنی سنٹرل وقف بورڈ اتر پردیش میں باضابطہ رجسٹرڈ وقف ہے بلکہ اس کا اندراج سرکاری گزٹ میں بھی ہے۔ یہاں بھی کوئی فرقہ وارانہ اختلاف نہیں رہا۔ افسوس کہ یہ بھی فرقہ پرستوں کی سازش سے نہ بچ سکی۔ ملک گیر گنیش مورتیوں کے دودھ پینے پلانے کے واقعہ کے بعد سے موضع پنھل کے ایک فرقہ نے وہاں پرانا شیو مندر اور وششٹ کٹی کا دعوی کر کے دیوالی کے دن بھانگ دھتورا چڑھا دیا۔ گرام پردھان دیوتا دین کی مخالفت کرنے پر تھانہ زید پور کی پولیس نے نقص امن کے اندیشہ میں دونوں فرقہ کے لوگوں کا دفعہ ۱۰۷/۱۱۶ میں چالان کر دیا ہے۔ درگاہ پر پولیس کی ڈیوٹی لگی ہوئی ہے جا کر ان میں اس کی گرم خبر چھپنے سے عوام میں غم و غصہ ہے۔

صوفی عبید الرحمن

صدر آل انڈیا مسلم مجلس ضلع بارہ بنکی

مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی مسلم دشمنی

گذشتہ دنوں ایک انگریزی اخبار کی ایک رپورٹ نے حکومت کی دیواروں کو ایک بار پھر ہلا کر رکھ دیا ہے اور نرسمہا راؤ اور کانگریس حکومت کے اس ناپاک ارادے کو طشت از بام کر دیا ہے کہ وہ کس طرح سیکولرازم کی آڑ میں ملک میں "ہندو راشٹر" کی مضبوط بنیاد رکھ رہے ہیں۔ مذکورہ رپورٹ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ نیشنل سیکورٹی گارڈ اور اسپیشل پروٹکشن گروپ جو کہ اہم شخصیات کی حفاظت کی خاطر قائم کیا گیا تھا اور جن میں تقرریاں ۱۹۸۸ء سے ہی ہو رہی ہیں ان دونوں تنظیموں میں نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ سکھوں اور عیسائیوں کی تقرری پر بھی غیر اعلانیہ طور پر پابندی ہے۔ اس رپورٹ میں مزید یہ چونکا دینے والے انکشافات بھی کئے گئے ہیں کہ ۱۶۲۰ ایکڑ پر مشتمل این ایس جی کا ٹریننگ کمپلکس جو ہریانہ میں واقع ہے اس کے اندر ایک عظیم الشان مندر بھی ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ اس فورس میں پچاس فیصد فوجیوں کی اور بقیہ پچاس فیصد میں نیم فوجی دستوں بی ایس ایف، سی آر پی ایف، آئی ٹی بی ایف، سی آئی ایس ایف اور ایس ایس بی کے جوانوں کی تقرریاں کی جاتی ہیں۔ تقرریوں کے وقت ریاستی حکومتیں ناموں کی فہرست ارسال کرتی ہیں جن پر مرکزی حکومت اپنی رضامندی دیتی ہے۔ اس واقعہ کی فطری توسیع یہ ہے کہ ایک ایسا ملک جس کی بنیاد سیکولرزم پر رکھی گئی ہے اور جس نے اپنے دستور کے دفعہ ۱۶ (۲) میں اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ "مرکزی اور ریاستی سطح پر سرکاری نوکریوں میں کسی بھی شہری کے ساتھ مذہب، رنگ و نسل اور زبان کی بنیاد پر امتیاز نہیں برتا جائے گا"۔ اس ملک کی ایک اتنی اہم تنظیم میں ۴۰۰۰ نفوس پر مشتمل یہ فوج کلیتاً ہندو فوج ہے جس میں ہندوؤں کے علاوہ دیگر کسی بھی مذہب خصوصاً مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کے افراد کی بحالی قطعی ممنوع ہے۔ یہ ہے ہمارا سیکولر ہندوستان اور اس کی سیکولر حکومت۔ کیا اس سے پہلے بھی ایسا ہوتا تھا یہ سوچنے اور غور کرنے کی بات ہے۔

انوار عالم خاں ایڈوکیٹ۔ کلکتہ

کانگریس و بی جے پی کو شکست دینے کی اپیل

دلت مسلم سرکشا مہا سنگھ کی مرکزی مجلس عاملہ اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی، لاقانونیت، ذات پات کی سیاست، علیحدگی پسندی اور مختلف طریقے کے جرائم میں اضافہ کی ذمہ داری کانگریس آئی اور بی جے پی پر عائد کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ ان دونوں ہی پارٹیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سیکولر طاقتوں کو متحد ہو جانا چاہئے اور اپنے تمام سیاسی اور نظریاتی اختلافات کو بھلا کر ملک کی آزادی، اتحاد، سالمیت اور سیکولر کردار کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے لئے جنگی پیمانے پر کام کرنے کو زور دیا گیا ہے۔

مرشد آباد (مغربی بنگال) کے تاریخی مقام شالار میں منعقد مشترکہ اجلاس میں ایک تفصیلی رپورٹ میں اترپردیش، آندھرا پردیش اور گجرات میں سیاسی تبدیلیوں میں کانگریس اور بی جے پی کے اندرونی مفاہمت اور توڑ پھوڑ کے طریقہ کار پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ قومی نائب صدر اور سابق ایم پی پروفیسر اچھنتا بسواس نے مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے ساتھ ہنوز جاری سوتیلاپن کے خلاف زبردست احتجاج کرتے ہوئے انتباہ کیا کہ اگر اس بیماری کو نہیں روکا گیا تو ملک کا بٹوارہ ہونا لازمی ہے۔

اجلاس میں ایک مشترکہ ریزولیشن پاس کر کے ممبران اور مندوبین نے آئندہ لوک سبھا اور اسمبلی چناؤ میں کانگریس، بی جے پی اور شیو سینا کے خلاف سیکولر پارٹیوں کے ساتھ تعلقات اور مفاہمت کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا گیا ہے۔

کریم خاں چودھری۔۔ ایلیٹ روڈ۔ کلکتہ

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی کچھ کریں

ہم نے آپ کا اشتہار بوسنیا کے بارے میں پڑھا، ہم لوگوں کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ہندوستان میں آپ جیسے لوگ بھی ہیں جو کہنے سے زیادہ کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ آپ نے جو قدم اٹھایا ہے وہ قابل تعریف ہے، ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ آپ کامیاب ہوں اور ہم کوشش میں لگے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو وہاں بھیجیں۔ لیکن میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی خراب حالت کے لئے کچھ کریں۔ ویسے تو کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے لیکن ہوسکتا ہے اللہ تعالی ہمیں اس کام کے لئے قبول کرلے۔

سیف الاسلام، جنید صدیقی، جنید خان

آشتا، مدھیہ پردیش

فراق گورکھپوری فاونڈیشن کا پہلا اجلاس

فراق گورکھپوری کا صد سالہ جشن منانے کے سلسلے میں نو تشکیل شدہ ادبی تنظیم فراق گورکھپوری فاونڈیشن کے زیر اہتمام آئندہ ۱۰ دسمبر کو دہلی کے ایل ٹی جی آڈیٹوریم میں ایک کل ہند مشاعرہ و سیمنار اور تقسیم ایوارڈ کی تقریب ہوگی جس میں فاونڈیشن کا پہلا ایوارڈ معتبر شاعر بلراج کومل کو پیش کیا جائے گا۔ فراق صدی تقریبات کے کنوینر کاوش پرتاپ گڑھی کے مطابق اس موقع پر سابق وزیر اطلاعات و نشریات ڈاکٹر گرجا ویاس سمیت کئی مرکزی وزراء کی شرکت متوقع ہے۔

ظفر انور شکرپوری۔ بلجیت نگر، نئی دہلی

آپ کو اجر ملے گا

ایک ایسے وقت میں جب کہ امت مسلمہ پر ایک گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے اور یہ امت دنیا والوں کے سامنے سرنگوں ہے اور ان کی مدد کی طالب ہے۔ قوم کے لیڈران اپنا الو سیدھا کرنے میں لگے ہیں اور مسلمانوں کی مدد کرنے یا ان پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے سے قاصر ہیں۔ آپ نے خالص دینی جذبے کے تحت ملی ٹائمز کے ذریعے بوسنیائی مسلمانوں اور دنیا کے تمام مسلمانوں کی مدد کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے اور عملی طور پر بھی اس کو انجام دے رہے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے اس کا صلہ اللہ تعالی آپ کو دنیا و آخرت میں عطا فرمائے گا۔ انشاء اللہ

شیخ اعجاز طاہر۔ بھیونڈی (مہاراشٹر)

ملی پارلیامنٹ کے نام

محترم قائد ملی پارلیامنٹ! میں روزانہ اخبار ریڈیو اور دیگر ذرائع کے ذریعہ بوسنیا میں ہوئے مسلمانوں پر مظالم کی خبریں سنتا رہتا ہوں۔ جس سے میرا خون کھولتا رہتا ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ میں صرف دعاؤں کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتا۔ مجھے اپنی قوم سے بے حد ہمدردی ہے اور ایثار کا جذبہ بھی میرے اندر موجود ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ پوری دنیا میں جہاں جہاں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے وہاں جاکر اپنے ملت کے لوگوں کی مدد کروں۔ آپ کا اشتہار پڑھا تو امید کی ہلکی کرن نظر آئی۔ میں ایک پچیس سالہ نوجوان ہوں اور چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی اپنی قوم کے لئے وقف کردوں۔ نہ صرف بوسنیا بلکہ کشمیر میں بھی ظلم و ستم کا بازار گرم ہے۔ اس طرح کئی ایسے مقامات ہیں جہاں ہمارے بھائی مظلوم بن کر ان کے ظلم کو سہہ رہے ہیں۔ اس طرح ہم سب مسلمانوں کو متحد ہو کر ایک منظم فیصلے کے تحت نظام کفر کی بنائی ہوئی سازش کو بے نقاب کرنا ہے۔

محمد حلیم احمد۔ جمشید پور (بہار)

سہسرام میں یوم سرسید

۱۷ اکتوبر کو سہسرام میں یوم سرسید منایا گیا جس میں شہر کی معزز شخصیات نے شرکت کی۔ اس موقع پر کلکٹر ایس ایم تمیم الدین نے حاضرین سے خطاب کیا۔ فوٹو نوشاد

”مجھے روزانہ اپنے کسی نہ کسی ساتھی کی تدفین کرنی پڑتی ہے“

پرتشدد کارروائیوں کے سبب کراچی جنازوں کا شہر بن گیا

کراچی میں خوں ریز تشدد کا سلسلہ جاری ہے۔ پولیس افسران مہاجروں کو دہشت گرد قرار دے کر ان کے خلاف صفائی مہم میں مصروف ہیں تو دوسری طرف مہاجرین کے گروپ نسلی تشدد میں مبتلا ہیں۔ اس خوں ریز جنگ میں نہ تو پولیس اخلاقی و قانونی ضوابط کی پابند رہ گئی ہے اور نہ ہی تشدد پرآمادہ گروہوں میں انسانی ہمدردی کی رمق باقی رہ گئی ہے۔ مذاکرات ہوتے ہیں تو ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ایک تاریک سرنگ میں کراچی کا مستقبل بھٹک گیا ہے اور وہاں سے اسے نکالنے میں نہ تو جنگ پرآمادہ گروہوں میں کوئی دلچسپی رہ گئی ہے اور نہ ہی پولیس و حکومت میں۔ حکومت بری طرح ناکام ہے اور عوام بندوقوں، مشین گنوں، راکٹوں اور پولیس مظالم کے نشانے پر ہیں۔ جنازے کراچی کا یومیہ معمول بن گئے ہیں۔ کہیں اشک بار لوگ اپنے بھائی بہنوں کی تدفین میں مصروف ہیں تو کہیں پولیس بندوقوں کی سلامی کے بیچ اپنے افسروں اور ساتھیوں کو قبر میں اتار رہی ہے۔ عجیب و غریب منظر ہے اور اس منظر سے کراچی کو نکالنے کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہو رہی ہے۔

جون میں کراچی کا پولیس چیف بننے کے بعد سے لے کر اب تک مسٹر شعیب سدلے اپنے سو افسران کو قبر میں اتار چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو ہلاک کرنے سے قبل بری طرح زدوکوب کیا گیا اور ان کے جسموں کو چھلنی کر دیا گیا تھا۔ شعیب کا کہنا ہے کہ جب وہ پہلی بار کراچی کے پولیس چیف بن کر وہاں گئے تو پولیس لائن میں ایک جنازے میں شرکت کے لئے جانا پڑا اور اس کے بعد سے مسلسل روزانہ انہیں ان کے افسران یا ماتحتوں کی لاشیں مل رہی ہیں جنہیں بری طرح زدوکوب کیا جا چکا ہوتا ہے۔ بقول سدلے مقتولین کے جسم میں سوراخ ہی سوراخ ہوتا ہے۔

پولیس اس کا الزام مہاجرین پر عائد کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ راکٹ لانچر سے لے کر چھوٹے بڑے ہتھیاروں سے لیس ہیں اور کراچی کے ۲۲ ہزار پولیس والوں کے خلاف ان لوگوں نے گوریلا جنگ شروع کر رکھی ہے۔ مہاجرین کے حملوں کے نتیجے میں دوسرے گروپ بھی میدان میں آگئے ہیں جس کے سبب اس سال ۱۶۰۰ افراد ہلاک اور دو سو پولیس افسران و ۲۰ رینجرز قتل ہو چکے ہیں۔ جبکہ مہاجرین پولیس پر زیادتی اور ناانصافی کا الزام لگاتے ہیں۔ ایک سماجی گروپ کے لیڈر جمیل یوسف کا کہنا ہے کہ رینجرز اور پولیس والے کسی بھی شخص کو اٹھا سکتے ہیں اور اسے دہشت گرد قرار دے کر مار سکتے ہیں۔ سینئر افسران اس کی تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ وہ آدمی دہشت گرد ہے یا نہیں، بہت ہی خطرناک صورت حال ہے اور ایک بھی فرد محفوظ نہیں ہے۔ پولیس زیادتی کی مثال کے طور پر ایک مہاجر مسٹر ظہور ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک رات پچھلے پہر کے وقت پاکستانی لباس میں ملبوس ایک شخص نے بندوق کی نوک پر اس کی کار چھین لی۔ لیکن جب وہ اس کی رپورٹ لکھوانے قریبی تھانے میں گئے تو میز کے پیچھے وہی شخص بیٹھا ہوا تھا جس نے ان کی کار چھینی تھی۔

پولیس ان الزامات کی تردید کرتی ہے اور انہیں انتظامیہ مخالف پروپیگنڈہ قرار دیتی ہے۔ لیکن الزامات کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا ہے۔ زیادہ تر مہاجر پولیس والوں کو بدعنوان بتاتے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ گذشتہ ہفتوں میں حراستی اموات میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ایک مقامی کالج میں ایک پروفیسر کا کہنا ہے کہ وہ کسی بھی لمحہ آسکتے ہیں آپ کو اٹھا لے جا سکتے ہیں اور پھر وہ آپ کے رشتے داروں کو اس کی اطلاع بھی نہیں دیں گے کہ آپ کو کہاں رکھا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پولیس آپ کو روکے گی اور کہے گی کہ تم مہاجر ہو اور پھر تم کو مرنا ہے۔

انتظامیہ پولیس حراست میں مشکوک طور پر مرنے والوں کی کوئی فہرست جاری نہیں کرتی لیکن گذشتہ دو مہینوں میں ایسی کم از کم دس اموات ہو چکی ہیں۔ ایک حالیہ معاملے میں محمد طاہر نامی ایک شخص کو اٹھا لیا گیا۔ ۲۲ اکتوبر کو اسے پوچھ گچھ کے لئے لے جایا گیا لیکن چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ایک ہسپتال میں اس کی موت کی اطلاع آگئی۔ افسران کوئی تفصیل جاری نہیں کرتے۔

دو ہفتہ قبل چار مشتبہ دہشت گردوں کو مار دیا گیا جب کہ وہ کراچی میں ایک گینگ کے خفیہ ٹھکانے پر پولیس کو لے جا رہا تھا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ ان کے گینگ کے لوگوں نے انہیں مارا جبکہ مہاجر قومی موومنٹ کا الزام ہے کہ ان چاروں کو پولیس افسران نے ہلاک کیا ہے۔

عالمی عدالت نے سرب لیڈروں کو جنگی مجرم تو ٹھہرا دیا ——— لیکن

کیا ان مجرموں کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا

سابق یوگوسلاویہ کے لیڈروں کے درمیان دس روزہ خفیہ گفتگو کے نتیجہ میں ڈیٹن، اوھیو میں ہونے والے سمجھوتے کے موقع پر امریکی وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر بھی موجود تھے۔ کرسٹوفر کے نزدیک اس معاہدے نے دو سال قبل امریکہ کی وساطت سے سربیائی جارحیت پر

قابو پانے کے لئے قائم کئے گئے وفاق میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ ایسا نہیں ہے کہ اس دس روزہ گفتگو میں امریکی حلیفوں نے کوئی معمولی کارکردگی دکھائی ہے جس کی بناء پر یہ کہا جا سکے کہ خون کے پیاسے دشمنوں کے درمیان معاہدے کے امکانات کچھ روشن نہیں ہوں گے

حقیقت یہ ہے کہ گفتگو خاصے اہم مرحلے میں داخل ہونے والی ہے۔ وفاق کے معاہدے کی تکمیل کے فوراً بعد ہی وفود نے امریکی مداخلت پر مبنی ایک ایسے امن معاہدے کا بنیادی معاملہ اٹھایا جس کے تحت بوسنیا کو دو حصوں میں منقسم کیا جائے۔ ایک سربیائی ریپبلک اور ایک مسلم کروٹس وفاق اور اس کے ساتھ ایک مرکزی حکومت کا ڈھانچہ اپنی جگہ برقرار رہے گا۔ اس امن معاہدہ کے گیارہ صفحات پر مشتمل دستور میں نو رکنی بوسنیائی بریزیڈنسی اور اڑتیس رکنی پارلیمنٹ کی ضمانت دی گئی ہے جس کی رکنیت کسی کو بھی دی جا سکتی ہے علاوہ جنگی مجرموں کے۔ تاہم گفتگو کی میز پر ایک پریشان سوال یہ بھی زیر بحث آیا کہ راجدھانی سیراجیو کو غیر منقسم رکھنے اور دوسری طرف اسے تقسیم کرنے کے متضاد بوسنیائی اور سربیائی مطالبوں کی تکمیل کیسے کی جائے۔ ایسی صورت میں ایک مغربی مندوب کے مطابق اب حکام کو یہی کرنا ہو گا کہ ہر گاؤں اور ہر پہاڑی کو بے ترتیبی سے کاٹا جائے۔

دوسری طرف بلجیم میں ناٹو کے منصوبہ ساز ایک معاہدہ پر پہنچنے کے لئے سر جوڑے بیٹھے تھے اور آخر کامیاب ہوئے۔ اس معاہدہ کے مطابق روسی فوجیں ساٹھ ہزار سپاہیوں کی ایمپلی مینٹیشن فورس میں شامل ہوں گے جو سمجھوتے کی کارروائی کی نگرانی کے لئے ترتیب دی گئی ہے۔ سربیائی صدر سلوبودون کو ایمپلی مینٹیشن پلان میں ان کے روسی حلیفوں کی شرکت کے امکانات سے خوشی ہوئی ہوگی لیکن ہیگ میں جنگی جرائم کی تفتیش ان کی اس خوشی پر مایوسی کی سیاہی پھیر دے گی۔ واضح رہے کہ ہیگ میں اقوام متحدہ کے دو سال سے

کیا سرب لیڈر کو سزا ملے گی

مصروف کار انٹرنیشنل کرمنل ٹریبونل نے تین یوگوسلاوی فوجی کمانڈروں کو ۱۹۹۱ء میں وکووار شہر پر قبضہ ہونے پر ۲۶۱ مردوں اور لڑکوں کے اجتماعی قتل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ تفتیش کے مطابق یوگوسلاوی فوجی ان مظلوموں کو وکووار کے ایک ہسپتال سے اٹھا کر دو میل دور ایک کھلے میدان میں لائے کئی گھنٹوں تک انہیں ایذائیں دیں۔ پھر انہیں گولی مار دی گئی اور بلڈوزر چلا کر انہیں ایک گڑھے میں دفن کر دیا گیا۔

اس مقدمے سے غیر ملکی امداد کے حصول اور بین الاقوامی پابندیوں کو اٹھوانے کے لئے ملوسووک کی کوششوں کی راہ میں رکاوٹیں آئیں۔ دریں اثنا عالمی عدالت نے سربیا کے باغی لیڈر اور سربیائی صدر کو جنگی مجرم قرار دیا ہے لیکن کیا ان مجرموں کو سزا بھی ہو پائے گی؟

اس کا امکان نظر نہیں آتا۔ ادھر کروشیائی صدر فرانجو تجمان نے بوسنیائی مقبوضہ تیل سے مالا مال مشرقی سلاوینیا میں فوج اتارنے کا عہد کر رکھا ہے۔ گذشتہ ماہ فرانجو نے کچھ اسلحہ اور چند سو فوجی وہاں بھیج کر اس عہد کی تکمیل کے ارادے کا اظہار کیا۔ اگرچہ جنگ ختم ہو چکی ہے مذکورہ علاقے کو ایشو بنا کر اگر کوئی تصادم ہوتا ہے تو امن مذاکرات کا بیڑہ ہی غرق ہو جائے گا۔ امید پرستوں کا خیال ہے کہ فرانجو محض ہوا باندھ رہے ہیں لیکن اگر مذاکرات طول پکڑیں گے تو ان پر ایک بار پھر ہتھیار اٹھانے کے لئے دباؤ پڑے گا۔ مشاہدین کا کہنا ہے کہ بلقان لیڈران سمجھوتے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور امریکی حکام کو خوش آئند علامات نظر آرہی ہیں کہ ان کے سایہ عاطفت میں آئے ہوئے فریق آپسی اختلافات اور دوری سے دست کش ہو کر معاملے کی بات کرنے پر آمادہ ہیں۔

اسلام بیزار علاقوں میں سڑکوں پر نماز اور مذہبی اجتماعات

ایران میں مغرب زدگی کے خلاف انقلاب پسندوں کی جنگ

آئندہ سال مارچ میں ایران میں عام انتخابات ہونے والے ہیں جس کی بالواسطہ تیاریاں ابھی سے شروع ہو گئی ہیں۔ خاص طور سے تہران کا مغرب زدہ طبقہ ابھی سے سرگرم عمل ہو گیا ہے۔ اس طبقہ کا نشانہ وہ اسلام پسند نوجوان ہیں جنہوں نے ہر قسم کی قربانی دے کر ۱۹۷۹ء میں امام خمینی کے انقلاب کو کامیاب بنایا تھا۔ ایسے نوجوان آج بھی تہران کی سڑکوں پر امریکی کلچر کی مخالفت اور اسلامی طرز زندگی کی ترغیب و حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طبقے کے خلاف مغرب زدہ عناصر نے آج کل ایک تحریک شروع کر رکھی ہے۔ دراصل وہ اس کوشش میں ہیں کہ مارچ کے انتخابات کے بعد معرض وجود میں آنے والی پارلیامنٹ میں بھی ان کے بقول معتدل لوگ منتخب ہو کر آئیں تاکہ وہ "قدامت پسندوں" کی سختیوں سے بچے رہیں۔ "معتدل" رفسنجانی حکومت کے دوران وہ جس طرح اپنے مغربی طرز زندگی کو بچائے رکھنے میں کامیاب رہے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہو۔ یہ مغرب زدہ عناصر زیادہ تر تہران کے خوشحال علاقوں میں رہتے ہیں اور جنہوں نے دل سے کبھی بھی اسلامی انقلاب کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ اندر ہی اندر اپنے اعمال سے اسے سبوتاژ کردیں۔ مغرب زدہ عناصر کے خلاف اسلام پسند نوجوان سرگرم ہوگئے ہیں۔ انہوں نے ایک نیا طریقہ اختیار کرکے اب تہران کے فیشن والے مغرب زدہ علاقوں میں احتجاج کرنے کے ساتھ سڑکوں پر مذہبی اجتماعات اور نماز پڑھنا شروع کردیا ہے۔ شمالی تہران میں بھی اس نئی اسلامی تحریک کا اچھا خاصا اثر پڑا ہے۔ بہت سے امیرزادے یہاں آئے اور متاثر ہو کر گئے۔

> یہ مغرب زدہ عناصر زیادہ تر تہران کے خوشحال علاقوں میں رہتے ہیں اور جنہوں نے دل سے کبھی بھی اسلامی انقلاب کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ اندر ہی اندر اپنے اعمال سے اسے سبوتاژ کردیں۔

لیکن بعض ایسے تھے جو دھینگا مشتی پر اتر آئے۔ انہوں نے اسلام پسندوں پر طنز کیا اور مارپیٹ کی۔ لیکن جب انہوں نے مغربی فلمیں اور گانے کھلے طور پر دیکھنے یا سننے کی کوشش کی تو اسلام پسندوں نے نہ صرف روک دیا بلکہ ایسی دو کانوں کے خلاف مظاہرہ بھی کیا۔ دراصل یہ دکانیں چوری چھپے یہ کاروبار کر رہی تھیں۔

اسلام پسند نوجوانوں نے عبدالکریم سروش کو بھی اب اسی کی زبان میں جواب دینا شروع کردیا ہے۔ یہ شخص مغرب زدہ ہے اور ایسے عناصر کی نظر میں دانشور ہے۔ اس کی ساری دانشوری یہ ہے کہ یہ کھل کر آیت اللہ خمینی کے انقلاب کی مخالفت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسلام جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اب یہ شخص جہاں بھی تقریر کر رہا ہے اسلام پسند نوجوان اور وہاں موجود سامعین میں سے دوسرے لوگ اس سے طرح طرح کے سوالات کرکے اس کا منہ بند کردیتے ہیں۔ مغرب زدہ صحافیوں نے اسے غلط انداز میں پیش کرکے دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ایران میں دانشوروں کو کھل کر بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ دراصل یہ دانشور سنجیدہ ڈائیلاگ کے بجائے یاوہ گوئی کی اجازت چاہتے ہیں جو کوئی ذمہ دار سماج نہیں دے سکتا۔

ان اسلام پسندوں نے حکومت پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ مغرب زدگی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہی ہے۔ ان کے بقول تہران میں بعض لوگ دھیرے دھیرے اور چوری چھپے مغربی تہذیب کو دوبارہ فروغ دے رہے ہیں۔ شمالی تہران کے خوشحال محلوں میں مغربی فلموں اور گانوں کے کیسٹ کھلے عام بک رہے ہیں، یہاں تک کہ ان چیزوں اور دوسری اشیاء کے اشتہار بھی چھپ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود حکومت نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی ہے۔ لیکن حکومت کے برعکس ایک انتہائی بااثر عالم آیت اللہ احمد جنتی نے ان کی حمایت کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایران میں انقلاب کے حامی ابھی سوئے نہیں ہیں بلکہ ان عناصر کے خلاف چوکس ہیں جو اسلام کی روایات کے بجائے مغرب کے دلدادہ ہیں۔

رابن قتل سے پہلے پیریز کے ہمراہ

بقیہ: ــــ کاش رابن کو کسی عرب نے مارا ہوتا

ہوگیا۔

اسحاق رابن کے والدین مشرقی یوروپ کے تارکین وطن تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش یکم مارچ ۱۹۲۲ء ہے۔ بچپن سے ہی وہ کٹر صہیونی تھے۔ دوسری جنگ عظیم اور یہودی ریاست کی تشکیل کے بعد ایک "فرض شناس" سپاہی اور حکمت عملی کی صلاحیت کے حامل شخص کی حیثیت سے انہیں فوجی نظام میں مرتبہ حاصل ہوا اور بتدریج ترقی کرکے وہ چیف آف اسٹاف ہوگئے۔

۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں فلسطینیوں کے قتل عام اور ان کی زمین کو ہڑپ کرکے اسرائیل کو فتح مند کرانے کا سہرا اگرچہ مغربی پریس نے موشے دایان کو دیا لیکن اہم

رابن کے قتل پر غازہ پٹی میں خوشی کی لہر

رول رابن کا ہی تھا۔ جنگ میں ان کے کردار کے مدنظر انہیں یقین تھا کہ ایک دن وہ وزیر دفاع یا وزیراعظم بنیں گے۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ امریکہ کے سفیر رہنے کے بعد ۱۹۷۳ء میں لیبر پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے کیبنٹ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں وزیراعظم کی حیثیت سے ان کا انتخاب اسرائیلی سیاست میں ایک نسلی تبدیلی کا اشاریہ بھی تھا کیونکہ وہ پہلے وزیراعظم تھے جن کا خمیر مقامی مٹی سے اٹھا تھا جب کہ اس کے برعکس اس سیاست پر یوروپی تارکین وطن یہودیوں کا غلبہ تھا جو ہمیشہ صہیونیت کی تعبیر و تاویل ہی پیش کرتے رہے۔ رابن طبعاً شکی تھے اور زبردست فوجی طاقت پر اعتماد نے ان کے ذہن میں بٹھا دیا تھا کہ مغربی ایشیائی امن کی توقعات حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ اسی لئے اپنے عرب حریفوں کی طرف دوستی کا قدم انہوں نے نیم دلی کے ساتھ بڑھایا تھا۔ وہ اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ ایک مستحکم ریاست کا وجود اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ فوجی صف آرائی سے دست بردار ہو لیا جائے۔ یعنی وہ فوجی صف آرائی کے حامی تھے۔ اسرائیل کی انتشار زدہ معاشیات کو صحیح ڈگر پر لانے میں قدرے کامیابی پالینے کے باوجود رابن وزارت عظمی کے منصب پر تین سال سے زیادہ نہیں ٹک سکے اور ۱۹۷۷ء میں بدعنوانی اور ان کی بیوی لیہہ کے نام امریکی بینکوں میں اکاؤنٹ کی صورت میں اسرائیلی قوانین کی خلاف ورزی کے الزام میں انہیں اس عہدے سے برطرف کردیا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں مخلوط حکومت میں وزیر دفاع کی حیثیت سے ان کی شمولیت سے ایک طرح سے ان کی سیاسی نوآبادکاری کی ابتداء ہوئی۔

بعد کے واقعات شاہد ہیں کہ ان کے رجحان میں خاصی تبدیلی آئی۔ ۱۹۸۷ء میں مغربی کنارے کے مقبوضہ علاقوں میں انتفاضہ کی سرگرمیوں کی شروعات کے سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ یہ مختصر سے انتہا پسند گروہ کا کام ہے جنہیں مارپیٹ کر ٹھیک کرلیا جائے گا۔ لیکن اس تحریک میں تیزی آتی دیکھ کر رفتہ رفتہ وہ اس کے قائل ہوگئے کہ فلسطینیوں کے مسئلہ کا کوئی بھی سیاسی حل پی ایل او سے براہ راست گفت و شنید سے خالی نہیں ہونا چاہئے۔ اس موقف کی بناء پر بے لچک وزیراعظم اسحاق شمیر کے دور میں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ آخر ۱۹۹۲ء میں لیبر پارٹی کی حکومت کی تشکیل ہوئی اور رابن دوبارہ وزیراعظم بنائے گئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اوسلو میں پی ایل او کے ذمہ داران سے گفتگو کے بعد مقبوضہ علاقے میں نام نہاد خود مختار فلسطینی ریاست کے قیام کے معاہدے پر دستخط کرکے نام نہاد امن کی طرف پیش قدمی کا اپنا عہد پورا کردیا۔ انہوں نے وہائٹ ہاؤس کے لان پر یاسر عرفات سے قدرے تکلف کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد اپنی تقریر میں کہا تھا۔ "ایک ہی سرزمین پر ایک ساتھ جینا مرنا ہمارا مقدر ہے۔ ہم جنگ سے لوٹے ہوئے زخمی سپاہی ہیں جن کی آنکھوں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو مرتے دیکھا ہے۔ اے اہل فلسطین تم سے جنگ کرنے والے ہم ہی ہیں لیکن آج ہم تم سے بہ آواز بلند کہتے ہیں کہ خون ریزی و ماتم کی اب انتہا ہو چکی ہے"۔ گویا جب تک رابن جنگ سے فلسطین کو فتح کرسکتے تھے انہوں نے جنگ کی لیکن انتفاضہ نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ اب وہ وقت نہیں رہا اور اگر اب معاہدہ نہیں کیا گیا تو اسرائیل کے وجود پر سوالیہ نشان لگ جائے گا۔ اسی سوالیہ نشان کو مٹانے کے لئے انہوں نے امن کا ڈرامہ رچا اور اس میں یاسر عرفات کو پھانس کر بالآخر نام نہاد امن کی بنیاد رکھی ان دونوں رہنماؤں کی انہی خدمات کے پیش نظر اکتوبر ۱۹۹۴ء میں مشترکہ طور پر رابن اور عرفات کو نوبل امن انعام دیا گیا

شرق اوسط کی ذہنیت کا ایک پہلو جو یہودیوں اور عربوں دونوں میں مشترک ہے وہ ہے تقدیر پرستی یعنی جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ اس خطے کی تاریخ میں اس کی کئی روشن مثالیں ہیں۔ دونوں کے درمیان دیرینہ نفرت کا سلسلہ کہیں ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ رابن نے بھی اس تصادم و تنازعہ کو اسی نظر سے دیکھا تھا اور راضی بہ تقدیر ہو کر بیٹھ رہے تھے لیکن حقیقت پسندی کا مادہ بھی ان میں پوری طرح تھا یعنی وہ اس کو محسوس کرتے تھے کہ اب امن معاہدہ کے علاوہ کوئی چارہ نہیں اور پھر انہوں نے امن کی تلاش میں قدم اٹھایا۔ اس خود ساختہ امن کی قیمت انہیں اپنی جان گنوا کر دینی پڑی اور اس طرح فلسطینی تاریخ کا ایک خوں چکاں باب بند ہوگیا۔

تربیت اطفال تعمیر شخصیت کا بنیادی پہلو ہے

بچوں کو صحت مند سانچے میں ڈھالنے کیلئے جزا اور سزا دونوں ضروری ہے

بچہ جب عمر کی اس منزل کو پہنچتا ہے جہاں وہ اپنے ذہن و عقل سے سوچنا شروع کردے اور اپنی بساط بھر صحیح اور غلط کے درمیان فرق کرنے لگے تو والدین یا اس کی تربیت پر مامور افراد کو اس طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ وقتاً فوقتاً انہیں ایسے سخت اور نرم طریقے اختیار کرنے پڑیں گے جو بچے کو صالح تربیت کی ڈگر سے ہٹنے نہ دیں۔ انسانی فطرت کا اصول ہے کہ آدمی خواہ کسی بھی عمر میں ہو اس کا کوئی بھی عمل یا تو کسی چیز کے حصول کی خواہش یا کسی چیز کے نقصان کے خوف کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہی اصول بڑی نزاکت سے بچے کی تربیت میں گھر کے اندر اختیار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ سزا اور ڈانٹ ڈپٹ خصوصاً جسمانی سزا کا پلہ بھاری نہ ہونے پائے کیونکہ اس کے امید افزا نتائج نہیں نکلتے۔ حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف انداز سے بچے کی حوصلہ افزائی زیادہ ہو۔ اس کی پسند کی چیزیں اسے انعام میں دی جائیں۔ یہ ضرور ہے کہ جب سزا اور سختی کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہ جائے تبھی اس کا سہارا لیا جائے۔ یہاں بھی یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ جو غلطی بچے سے سرزد ہوئی ہو اس کے مقابلے میں سزا زیادہ سنگین نہ ہوجائے۔ اس ضمن میں اندازے کی غلطی سے بھی معاملہ خراب ہوسکتا ہے۔

بچوں کی غلطیوں پر جزا یا انعام اور سزا سے متعلق ایک نفسیاتی نکتہ یہ بھی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ بچے جب غلطی کریں تو اس کے کافی دن بعد اسے سزا دی جائے یہ کہہ کر کہ فلاں دن فلاں موقع پر تم نے یہ غلطی کی تھی۔ یا یہ کہہ کر اس کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ فلاں موقع پر تم نے یہ اچھا کام کیا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ گرم لوہے پر چوٹ کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح دونوں صورتوں میں بچے کے ذہن پر تشجیعی اور تادیبی سلوک کی فوری تاثیر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا ذہن اپنی غلطی کا اندازہ کرکے آئندہ کے لئے اسے باز رکھنے کا اور نیک عمل کی افادیت کے احساس سے وہ آئندہ بھی اچھے کام کی طرف راغب ہوگا۔

بچوں کی تنبیہ و تادیب کے معاملے میں ماں اور باپ دونوں کو ایک موقف پر متفق ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ باپ سخت گیری کر رہا ہے اور اس کا اثر بھی بچے پر ہو رہا ہے اتنے میں ماں اس کی حمایت میں کھڑی ہوجائے اور باپ کو لعنت و ملامت کرنے لگے اور زیادہ تر یہی ہوتا ہے۔ اس سے بچے کا ذہن یہ تاثر قبول کرتا ہے کہ اس پر بیجا ظلم ہو رہا ہے اور یہیں سے اس میں سرکشی کی بنیاد پڑنے لگتی ہے۔ اس نازک مسئلہ پر والدین میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے اور بچے کو ہرگز یہ سوچنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے کہ کسی غلطی پر اگر ایک سختی کرے گا تو دوسرا اسے بچالے گا۔

بے محل نہ ہوگا اگر والدین کو تربیت اطفال کے ایک اور سنجیدہ پہلو کی طرف متوجہ کیا جائے۔ بعض والدین اپنے بچوں کو پیٹھ تھپتھپا کر یہ سبق دیتے ہیں کہ جو تمہیں مارے تم بھی اسے مارو۔ یہ الفاظ اپنے اندر گہری تاثیر رکھتے ہیں اور بچے کو عناد، دشمنی اور تشدد کی راہ پر لگاتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ تربیت کا یہ غلط انداز، بچے میں غیر شعوری طور پر بغاوت و تشدد کو جنم دیتا ہے جو اس کی عمر کے مختلف مراحل میں الگ الگ شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر عمر کے دوسرے سال میں اس کی زبان سے زیادہ تر باتوں کے لئے نہیں کا ادا ہونا اسی سرشت کا اظہار ہے یا اس کا دوسرا طریقہ رونے دھونے اور زمین پر پیر پٹخنے کی زیادتی ہے۔ اس کا مقصد بڑوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنا بھی ہوتا ہے اور اس چیخ و پکار کی حالت میں وہ گھر کی کوئی چیز توڑ بھی سکتا ہے۔ اور آخر جب کسی طرح قابو میں نہ آئے تو ماں کو چاہیے کہ اسے دودھ پلانا بند کردے۔ اس طرح اسے اندازہ ہوگا کہ اپنی پسند یا ناپسند پر دوسرے سے عمل کرانے کا وہ طریقہ نہیں ہے جسے اس نے اختیار کیا تھا۔ مانا کہ شیر خواروں میں احتجاج و بغاوت کا عنصر ایک عام تجربے کی بات ہے لیکن اس بغاوت کو فرو کرنے میں بیشتر مائیں بے بس نظر آتی ہیں۔

بچّے بڑے نمازیوں کی صف میں کھڑے ہوجائیں تو ہم کیا کریں؟

سوال: ــــ بعض دیندار لوگوں سے سنا گیا ہے کہ باجماعت نمازوں میں بچوں کو سب سے پیچھے کھڑا ہونا چاہیے۔ اس سے بعض دقتیں پیدا ہوسکتی ہیں خصوصاً ان بچوں کے معاملے میں جو بہت چھوٹے ہوں۔ براہ کرم وضاحت فرمائیں۔؟

جواب: ــــ پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والے بچے اگر چار چھ ہوں تو وہ تمام بالغ نمازیوں کے پیچھے اور عورتوں سے آگے ایک صف بنالیں۔ لیکن یہ طریقہ وہی بچے اختیار کرسکتے ہیں جو کہ نماز کے ارکان کی سمجھ رکھتے ہوں اور بخوشی صف میں کھڑے رہ سکتے ہوں۔ بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر بچے بڑے نمازیوں کی صف میں کھڑے ہوجائیں گے تو نماز میں کوئی خرابی واقع ہوجائے گی حالانکہ ایسا ہے نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگ مسجد میں اپنے چھوٹے بچوں کو بھی لاتے تھے۔ اتنے چھوٹے کہ ان سے یہ توقع نہیں کہ جاسکتی تھی کہ وہ کسی کے حکم پر اپنی الگ صف بناکر اس میں کھڑے رہنے کو گوارہ کرلیں گے۔ اس لئے وہ ماں یا باپ میں سے کسی کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعض دفعہ میرا جی چاہتا ہے کہ نماز لمبی کروں کہ اتنے میں کسی بچے کے رونے کی آواز کان میں آجاتی ہے اور میں اس بچے کی ماں کی رعایت سے نماز مختصر کردیتا ہوں۔

مستند حوالوں سے یہ ثابت ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں جاتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے پیٹھ پر سوار ہوجاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے کو معمول سے زیادہ طویل کردیتے، یہاں تک کہ نماز میں شریک بعض لوگوں کو یہ خوف ہونے لگتا کہ خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواسہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر سات سال سے کم رہی ہوگی۔ ورنہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر بچہ بہت چھوٹا ہے تو وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ہی رہنا چاہے گا۔ اس لئے نماز میں ماں یا باپ کے ساتھ اس کے کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

شافعی مسلک کے مطابق اگر مسجد میں کئی چھوٹے بچے ہیں تو ان کی تقسیم اس طرح ہو کہ ایک بچہ دو بالغ کے درمیان کھڑا ہو تاکہ بچے نماز کا طریقہ سیکھ سکیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی بچہ بالغ نمازیوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر قرآن کریم کی تلاوت کرسکتا ہے تو اس کی امامت بھی جائز ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سب سے اچھی تلاوت قرآن کریم کرسکتا ہو اسے امام بنایا جائے۔

سوال: ــــ کیا تدفین سے پہلے میت کو غسل دینا ہر حال میں لازم ہے۔ اگر نعش میں سڑن اور تدفین پیدا ہوجائے تب بھی؟ جس نے خودکشی کی ہو اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔؟

جواب: ــــ میت کو نہلا دھلا کر تدفین کے لئے تیار کرنا ضروری ہے۔ غسل کے پانی میں عطر ملاکر غسل دیا جاسکتا ہے۔ اگر نعش ایسی حالت میں لائی گئی ہو کہ اس میں گلنے کے آثار پیدا ہوگئے ہوں تو بھی غسل کی ضرورت اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسی صورت میں غسل اور بھی لازم ہوجاتا ہے۔ موت کے تیقن کے بعد میت کی تدفین کی تیاری فوراً شروع کردینی چاہیے۔

سوال: ــــ بعض مسلم ممالک میں دیکھا گیا ہے کہ جنازہ مسجد کے اندر نہیں لایا جاتا جب کہ دیگر ممالک میں جنازے کی نماز مسجد کے اندر ہی پڑھائی جاتی ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔؟

جواب: ــــ جنازے کی نماز مسجد کے اندر، مسجد کے باہر اور قبرستان کے قریب ان تینوں جگہوں پر پڑھی جاسکتی ہے۔ ہاں افضل یہ ہے کہ قبرستان کے اندر نماز جنازہ نہ ادا کی جائے حالانکہ غیر مقبول نہیں ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنازے کی نماز مسجد کے اندر پڑھاتے تھے۔ حرم مکی اور حرم مدنی دونوں جگہوں پر جنازے برابر لائے جاتے ہیں اور وہاں نماز پڑھائی جاتی ہے یہ صورت ہر اعتبار سے جائز ہے۔

سوال: ــــ کسی کا انتقال ہوجانے کے بعد سوئم اور چالیسویں جیسی رسوم کی کیا کوئی شرعی حیثیت ہے۔؟

جواب: ــــ کسی کے انتقال کے تیسرے، ساتویں، دسویں اور چالیسویں دن پر اس کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے لوگ جو کچھ کرتے ہیں یا برسی مناتے ہیں اس کی کوئی اسلامی حیثیت نہیں ہے۔ یہ سب بدعات ہیں اور ان پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔ وہ مسلمان جس نے ان رسوم کو اس بناء پر چھوڑا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ خود ایسی کوئی رسم کی اور نہ ہی دوسروں کو ایسا کرنے کی تلقین کی اسے ہدایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے کا بڑا اجر ملے گا۔ ان کاموں سے مرنے والے کو کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں ہے کیونکہ وہ اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

سوال: ــــ جب مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ میری کتنی بہنیں ہیں تو میں فوراً کہتا ہوں چار۔ جب کہ میری تین بہنیں ہیں اور ایک چچا کی لڑکی ہے جو میرے گھر کی ہی فرد ہے۔ اس کی شادی ہوچکی ہے اور اس کا شوہر بھی اس سے ہمارے اس تعلق کی قدر کرتا ہے۔ تاہم لوگ ہمارے بارے میں طرح طرح کی سرگوشیاں کرتے ہیں جس سے بڑی اذیت پہنچتی ہے۔ آپ کیا مشورہ

باقی صفحہ ۱۲ پر

مشینوں پر انسانی زندگی کے انحصار سے موٹاپے کی شرح میں اضافہ ——— مگر

اب آپ انجکشن لگوا کر تکلیف دہ موٹاپے سے نجات پا سکتے ہیں

دُنیا میں موٹے اور مردوں لی موجودہ اوسط شرح بالترتیب تیرہ اور سولہ فیصد ہے جو آج سے چھ سال قبل کے اعداد و شمار سے دو گنی ہے۔ موٹے لوگوں کی تعداد میں اس خطرناک اضافے کے اسباب کا جائزہ لیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مشینوں پر انسانی زندگی کا انحصار بڑھتا جارہا ہے جس سے انسانی جسم کی حرکت پذیری متاثر ہوئی ہے۔ جسم کے اندر کی جن فاضل روغنیات کو روزمرہ کی سرگرمیوں کے دوران زائل ہونا چاہئے تھا ان کے لئے اب الگ سے وقت نکالنا پڑتا ہے اور وقت بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔ یہی اس مسئلے کا سنگین ترین پہلو ہے۔ سائنسی اور تکنیکی اعتبار سے جو معاشرہ جتنا ترقی یافتہ ہے اسی قدر اس کے افراد کو موٹاپے اور کثیر وزنی جیسی مشکلات کا سامنا ہے۔ مثال کے طور پر مغرب میں پندرہ سال کے اوپر کی عمر کے افراد میں سے ایک تہائی ایسے ہیں جو اپنے بدن کو چھریرا اور چاق و چوبند رکھنے کی حسرت لئے جی رہے ہیں۔ ان میں مردوں اور عورتوں کا تناسب ایک اور تین کا ہے۔ برطانیہ میں ۴۵ فیصد مردوں اور ۳۶ فیصد عورتوں کا وزن اوسط معیار سے زائد ہے۔

موٹاپا کم کرنے کے عام طریقہ ابھی تک کم خوری رہا ہے یا بعض دواؤں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے خوش آئند نتائج برآمد نہیں ہوتے ہیں کیونکہ اس پر مستقل کاربند رہنے سے صحت پر منفی اثرات پڑنے کا اندیشہ ہے۔ ان عوامل کے پیش نظر سائنسدانوں نے بعض ایسے تجربات شروع کئے ہیں جن کا مقصد جسم میں بننے والی زائد چکنائی کو پگھلانا اور اسے

> موٹاپا کم کرنے کے عام طریقہ ابھی تک کم خوری رہا ہے یا بعض دواؤں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے خوش آئند نتائج برآمد نہیں ہوتے ہیں کیوں کہ اس پر مستقل کاربند رہنے سے صحت پر منفی اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔

زائل کرنا ہے۔ اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ایسا کوئی بھی تجربہ بہت دنوں تک پہلے جانوروں پر کیا جاتا ہے، اس کے نتائج کی چھان بین ہوتی ہے اور ان نتائج کی روشنی میں ایسا طریقہ کار وضع کیا جاتا ہے جس کے تحت انسانوں پر اسی تجربے کے اثرات کا اندازہ ہوسکے۔

موٹاپا کم کرنے کا تجربہ ابھی تک چوہوں پر کیا گیا ہے۔ کچھ نسبتاً زیادہ موٹے چوہوں کو تجربہ گاہوں میں رکھ کر ان کو ایک تو دریافت شدہ پروٹین کے انجکشن لگائے گئے جس کا نام لپٹین ہے۔ ایک ماہ کے بعد ان کا وزن ۳۸ گرام سے گھٹ کر ۹ گرام رہ گیا۔ پروٹین جسم کی چکنائی کے اندر ایسے تھرمواسٹیٹ سگنل کے طور پر پیدا کیا جاتا ہے جو بھوک کے احساس کو ابھارنے اور دبانے کا کام کرے۔ یہ تجربہ ہوورڈ ہیوز میڈیکل انسٹی ٹیوٹ نیویارک میں جاری ہے۔

چوہوں میں وزن گھٹانے کی لپٹین کی صلاحیت سے امید بندھ رہی ہے کہ انسانی جسم پر بھی اس کے وہی اثرات ہوں گے اور ایسی ایک مثال بھی اگر قائم ہو گئی تو خیال کیا جاتا ہے کہ مذکورہ پروٹین کی تجارتی اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہوجائے گا۔ بائیوٹیک مصنوعات تیار کرنے والی مشہور امریکی فرم آمگن نے راکفلر یونیورسٹی کو بیس ملین ڈالر کا ایک ٹھیکہ صرف ایسے جین کی دریافت کے لئے دیا ہے جو موٹاپے کا تدارک کرسکیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دواسازی اور اس سے متعلق صنعتوں میں مصروف فریں کرشماتی موٹاپا شکن دواؤں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کتنی بے تاب ہیں

سائنسی تحقیق میں مصروف دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ شاید یہ طریقہ انسانوں پر کارگر نہ ہوسکے۔ اس ضمن میں ان کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ جن چوہوں پر لیباریٹری میں تجربہ کیا گیا اور جنہیں لپٹن کے انجکشن دئے گئے وہ عام طور پر پائے جانے والے چوہے نہیں بلکہ غیر معمولی ڈیل ڈول اختیار کرجانے والے چوہے تھے نیز یہ کہ لپٹین کے ذریعے چوہوں کے موٹاپے کو ہی کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ انسانی جسم پر اس کا اطلاق ہو نہیں پائے گا۔ انسانی جسم کے موٹاپے کے، اس گروہ کے خیال میں مختلف دوسرے اسباب ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ موٹاپا اور بسیار خوری شراب، نیکوٹین اور کوکین کی لت کی طرح ہے جس میں ایک مخصوص نفسیات پس پردہ کام کرتی ہے۔

نیند طاری کرنے کا ایک زود اثر نسخہ یہ بھی ہے

آج سے ایک صدی قبل مریض پر کسی قسم کے عمل جراحی کے مقصد سے بے ہوشی طاری کرنے کے لئے دوا یا گیس کا سہارا نہیں لیا جاتا تھا۔ اس کا طریقہ حد درجہ آسان تھا اور اگر کوئی دوا وغیرہ استعمال کی جاتی تھی تو بس یہ کہ الیکٹرک فیلڈ کی پٹی مریض کے سر پر لپیٹ دی جاتی تھی۔ بعض وجوہ سے الیکٹرو نرکو لیپسس کا طریقہ چل نہیں پایا لیکن اس کی جگہ املس تھیسیا یا جسم کو بے حس کرنے والی دواؤں نے لے لی بلکہ اس کی وجہ سے دوا سازی کی صنعت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگیا۔

مشینوں کے ذریعہ نیند کے مزے لیجئے

لیکن بعض ذہن اب بھی اس نہج پر سوچ رہے ہیں کہ الیکٹرک فیلڈ کے طریقے کو کس طرح بہتر استعمال میں لایا جائے۔ آخر حال ہی میں امریکہ اور سوئٹزرلینڈ کے سائنسدانوں کی ایک جماعت نے الیکٹرک فیلڈ کو موجودہ زمانے کی ضروریات سے ہم آہنگ کرنے کو اپنی مشترک تحقیق و جستجو کا مقصد بنایا ہے۔ اس جماعت کی طرف سے شائع ہونے والے جریدے بایو الیکٹرو میگنیٹکس میں شامل ایک رپورٹ کے مطابق کمزور الیکٹرک فیلڈ کے استعمال سے صحت مند افراد پر نیند طاری کی جاسکتی ہے۔ جن لوگوں پر اس کا تجربہ کیا گیا وہ کوئی دوا استعمال کے عام حالات کے مقابلے میں کافی جلد بیداری سے خواب کی حالت میں پہنچ گئے اور زیادہ دیر تک گہری نیند میں سوئے رہے۔

اس دور میں جب کہ انسان آئے دن کی پریشانیوں کے ہاتھ بے خوابی کا شکار ہورہا ہے الیکٹرک فیلڈ کی مدد سے آناً فاناً سوجانے کا طریقہ کافی پرکشش نظر آتا ہے لیکن اس میں ایک قباحت بھی ہے۔ الیکٹرک فیلڈ آلے کی میکانکی تفصیل پر غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ اس کے برقی سرے یعنی الیکٹروڈ کو طالب خواب کے منہ میں لگا کر ایچ زیڈ ۴۲ پر ہلکی طاقت کا کرنٹ پندرہ منٹ کے وقفے کے لئے گزارا جاتا ہے۔ اس کا یقین کرنے کے لئے کہ اس طریقے کا زیر تجربہ افراد پر کوئی منفی نفسیاتی اثر تو نہیں مرتب ہوتا دوہری آزمائش کی گئی۔ تمام افراد کے منہ میں برقی سرے انہیں یہ بتائے بغیر لگائے گئے کہ کرنٹ کھلا ہے یا بند ہے۔ زیر تجربہ تمام ۵۲ افراد کو سوئچ آن کرتے ہی برقی رو کے زیر اثر نیند آنے لگی اور جب سوئچ آف کیا گیا تو انہیں نیند سے پہلے جیسی حالت میں پایا گیا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ منہ کے اندر الیکٹروڈ لگانے سے پرسکون نیند کا لطف نہیں لیا جاسکتا لیکن Electronarcolepsis کی شکل میں ایسی

> اس دور میں جب کہ انسان آئے دن کی پریشانیوں کے ہاتھ بے خوابی کا شکار ہورہا ہے الیکٹرک فیلڈ کی مدد سے آنا فانا سوجانے کا طریقہ کافی پرکشش نظر آتا ہے لیکن اس میں ایک قباحت بھی ہے

چیز سائنسدانوں کو مل گئی ہے جو خواب آور گولیوں کا نعم البدل بھی ہے اور ایسی دواؤں کے مضر اثرات سے محفوظ بھی رکھتی ہے۔

سرد موسم میں اسکرٹ پہننے والی خواتین میں اس عادت سے قوت برداشت کا ایسا مادہ پیدا ہوجاتا ہے جو اسکیمو کی جسمانی فطرت سے قریب کردیتا ہے اسکیمو میں سردی برداشت کرنے کی غضب کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جما دینے والے درجہ حرارت پر بھی وہ گہری نیند سوسکتے ہیں جب کہ ایسی حالت میں دوسرے لوگ ساری رات سردی سے تھر تھر کانپتے رہتے ہیں۔ اسکیمو لوگوں کا کور باڈی ٹمپریچر قدرتی طور پر کم ہوکر اس میں سردی کو جذب کرلیتا ہے Matabolism سست پڑجاتا ہے۔ یہی بات اسکرٹ پوش خواتین کے ساتھ بھی ہے۔ اس سلسلے میں انٹر نیشنل جرنل آف بایو میٹرولوجی کے مطابق جاپانی سائنسدانوں نے ایک انکشاف کیا ہے۔ وہ یہ کہ ستمبر سے نومبر تک کے عرصے میں شمالی نصف کرے میں جب موسم سرد ہوتا ہے تو ایسی خواتین کے کور ٹمپریچر اور دل کی حرکت بتدریج سست پڑجاتی ہے۔ وہ سردی کو عملی طور پر اپنے مزاج کا حصہ اسی طرح بنا لیتی ہیں جیسے کہ اسکیمو، ہاں اس کی شدت ضرور مختلف ہوسکتی ہے۔ اس کے برعکس پتلون پوش خواتین پر سردی اس طرح اثر انداز نہیں ہوتی۔ گویا کہ اول الذکر صورت میں سردی سے دفاع کا قدرتی طریقہ چھپا ہوا ہے۔

افغانستان میں روسی مفادات کے خاتمے سے روسی فوجیں فرار پر آمادہ ہوئے

کیا روس نے افغانستان سے رضاکارانہ پسپائی اختیار کی تھی

افغانستان پر روسی حملے اور شکست خوردہ روسیوں کی پسپائی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ عام رائے یہ ہے کہ امریکی امداد کی بدولت، خصوصاً اسٹنگر میزائل کی مدد سے مجاہدین نے روسیوں کو ناکوں چنے چبوادیے اور مجبوراً انہیں افغانستان کو خیرباد کہنا پڑا۔ مغربی مصنفین خاص طور سے اس خیال کے حامی ہیں کہ افغانوں کی آزادی پسندی، ان کی جرات و بہادری کو جب امریکی مالی و فوجی مدد مل گئی تو یہ ایک ایسا ہتھیار ثابت ہوئی جس کا جواب اس وقت کے سپر پاور روس کے پاس نہیں تھا۔ بالعموم یہ اہل قلم اس امر کو نظرانداز کردیتے ہیں کہ افغانستان کے دلدل ہی میں پھنس کر روس کی گرتی ہوئی معاشیات بری طرح تباہ ہوئی اور بالآخر کمیونسٹ ایمپائر کے زوال کا سبب بنی۔

زیر تبصرہ کتاب میں کورڈویز اور ہیریسن نے ایک بالکل ہی مختلف تصویر پیش کی ہے۔ ان کے خیال میں جنگ افغانستان نے روس کی کمر نہیں توڑی۔ بلکہ ان کے خیال میں روس میں تبدیلی کے آثار بہت پہلے نمایاں ہونے لگے تھے۔ دونوں اہل قلم اس بات پر متفق ہیں کہ لیونڈ بریژنیف کے طویل عہد حکومت میں، اسٹالن کے برعکس یا اس کے خلاف بعض ایسی نظریاتی تبدیلیوں نے جنم لیا جن کی وجہ سے نئے لیڈر اور جدید و تازہ نظریات و خیالات کو پنپنے کا موقع ملا جنہوں نے بالآخر کمیونزم کا دم توڑ دیا۔ یہ دراصل زوال پذیر کمیونزم تھا جس نے روس کو افغانستان میں جارحیت پر آمادہ کیا تھا۔

ہیریسن مدتوں ایشیا کے مختلف ممالک اور علاقوں میں اخباری رپورٹر رہ چکے ہیں۔ سردست وہ کارنیگی فاؤنڈیشن میں سینئر ریسرچ اسوسی ایٹ برائے انٹرنیشنل پیس (امن) ہیں۔ کتاب کے دوسرے شریک مصنف کورڈویز اقوام متحدہ کے انڈر سکریٹری جنرل برائے خصوصی سیاسی معاملات رہ چکے ہیں۔ کورڈویز بذات خود روس و افغان مجاہدین کے درمیان امن کوششوں میں براہ راست شریک رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امن کے مختلف فارمولوں اور کوششوں کے بارے میں انہوں نے کافی تفصیل سے لکھا ہے اور انتہائی قیمتی مواد فراہم کیا ہے۔ دونوں ہی اہل قلم نے اس جنگ کے بارے میں روسی نقطہ نظر جاننے کے لئے کافی محنت کی اور اس کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہاتھ سے چھوڑے جانے والے ہلکے اسٹنگر میزائل نے روسیوں کو پسپائی پر مجبور نہیں کیا تھا بلکہ طویل جنگ کے بعد روسیوں کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ افغانستان پر ان کا قبضہ اب ان کے مفادات کے خلاف ہے۔ گویا جنگ میں شکست کھانے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس احساس نے کہ افغانستان پر مزید قبضہ روسی مفاد میں نہیں ہے، انہیں اس سنگلاخ زمین سے فرار پر آمادہ کیا۔

مجاہدین اور روسی فوجوں میں جنگ کے بعد کابل کی تباہی کا ایک منظر

لیکن ایسا لگتا ہے کہ کورڈویز اور ہیریسن نے محض عام روش سے ہٹ کر ایک نیا نتیجہ نکالنے کی خاطر جنگ افغانستان سے متعلق روسی نقطہ نظر کو غیر تنقیدی انداز میں قبول کرلیا ہے۔ روسیوں نے محض اپنی خفت مٹانے کے لئے یہ کہہ دیا کہ افغانستان سے شکست کھا کر وہ پسپا نہیں ہوئے بلکہ خود بخود واپس آگئے کیونکہ "رضاکارانہ" پسپائی ہی میں ان کا مفاد تھا اور ان "معصوم" اہل قلم نے اس نقطہ نظر کو قبول بھی کرلیا۔ کئی دوسرے اعتبار سے ایک اچھی کتاب کا یہ نتیجہ کافی مضحکہ خیز ہے۔

Out Of Afghanistan : The Inside Story Of The Soveit Withdrawal

By Diego Cordovez

And Selig S.Harrison

Oxford University Press $ 35

آپ کی الجھنیں

مشیت ایزدی کو انسانی جسم کا بیجا تصرف منظور نہیں

سوال: — میں ۲۴ سالہ مسلم لڑکی ہوں۔ حال ہی میں میری شادی ایک نومسلم لڑکے سے ہوئی ہے۔ میری کچھ سہیلیوں کا کہنا ہے کہ شریعت کے حساب سے اگر دھوکے سے بھی شوہر کا منہ بیوی کے دودھ پر چلا جائے تو طلاق ہو جائے گی۔ میری اس مصیبت کا صحیح حل کیا ہے؟۔

جواب: — آپ کی سہیلیوں کا خیال بالکل غلط ہے۔ کوئی عورت کسی مرد کے لئے محرم اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اس نے اسے دودھ پینے کی عمر جو دو ڈھائی کے درمیان عموماً سمجھی گئی ہے دو چسکی (اور بعض ائمہ کے نزدیک پانچ چسکی) تک دودھ پلایا ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ رضاعت کے اعتبار سے حرمت کے لئے رضاعت کی شرعاً مقررہ عمر بنیادی شرط ہے۔ یہاں معاملہ یہ ہے کہ ایک نومسلم شخص اپنی بیوی کی چھاتی منہ میں لے لیتا ہے۔ ایسا اس لئے نہیں ہے کہ وہ نومسلم ہے اور اس کے عقیدے میں پختگی نہیں آئی ہے اس لئے وہ ایسا کر رہا ہے بلکہ انسانی جبلت کے تحت جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر ایسا کر بیٹھتا ہے۔ گویا کہ مباشرت سے براہ راست تعلق نہ رکھنے والے اعضاء سے بھی وہ جنسی تسکین حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ رضاعت کے بارے میں اوپر ذکر ہوا اس حد سے نکل جانے پر ایسا کوئی فعل لایعنی عمل قرار پائے گا جو شرعی اعتبار سے نہ لائق مواخذہ ہے نہ اس پر کوئی کفارہ واجب ہوتا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ اللہ نے اپنے بھیجے گئے دین کے ذریعے دنیا پر واضح کردیا ہے کہ انسانی جسم اور حیوانوں اور اشیاء کے مقام چوسنے میں بڑا فرق ہے۔ اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ انسانی جسم کا احترام بھی اسے ہر حال میں مقصود ہے۔ غور کیجئے کہ ایک شخص گائے یا بھینس خرید کر لاتا ہے جب تک وہ دودھ دے سکتی ہے گھر کے تمام افراد بلاامتیاز عمر حسب خواہش پیتے ہیں۔ دوسری طرف ماں ہے جس کا دودھ صرف اس بچے کے لئے مخصوص ہے جسے اپنی نشو و نما کے ابتدائی چند برسوں میں اس کے دودھ کی اشد ضرورت ہے اور جیسے ہی اس ضرورت کی شدت ہلکی پڑنے لگتی ہے اور بچہ دودھ کے علاوہ دیگر چیزوں سے ذرا بھی منہ لگانے لگتا ہے تو ماں کو حکم ہوتا ہے کہ اب وہ دودھ پلانا اسے بند کردے۔ ظاہر ہوا کہ مشیت ایزدی کو انسانی جسم کا بیجا تصرف منظور نہیں۔ حیات انسانی کی بقا کے لئے رضاعت کی سبیل پیدا کی۔ اس طرح اگر افزائش نسل اللہ کو منظور نہ ہوتی تو زوجین کے مابین جنسی اختلاط کے بظاہر قبیح مظہر میں کوئی کشش نہ رکھتا۔

اگر شوہر کے اس عمل سے کوئی تشویش تھی تو سہیلیوں سے مشورہ کرنے کے بجائے آپ اپنے شوہر سے گفتگو کرتیں تو شاید آپ کو اس پریشانی سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔

ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ زن و شوہر کے تعلقات کی پردہ داری بہت ضروری ہوتی ہے۔ اگر شوہر کے اس عمل کی طرف سے کوئی تشویش تھی تو بجائے اس کے کہ پہلے آپ اپنی سہیلیوں سے مشورہ طلب کرتیں اس بارے میں شوہر سے گفتگو کرتیں تو آپ کی پریشانی اسی وقت دور ہو جاتی۔

سوال: — میرا ڈیرہ ایک گھر میں تھا اس گھر کی ایک لڑکی کو مجھ سے عشق ہوا اور وہ روز مجھے مجبور کرنے لگی کہ مجھ سے محبت کرو۔ میں نے تنگ آکر اس سے محبت کی۔ شرط یہ تھی کہ میں نے اس سے پوچھا سچ بتا کہ تو نے پہلے بھی کسی سے محبت کی ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ ایک لڑکے پر دل آگیا تھا لیکن محبت نہیں کی تھی۔ میں نے اس کو کہا کہ اگر تو نے جھوٹ بولا تو میں محبت کرنا چھوڑ دوں گا۔ پھر اللہ جانتا ہے کہ سچ بولا تھا یا جھوٹ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا کہ اس لڑکی کا کیرکٹر ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے میں جھوٹ سمجھتا تھا لیکن جب سب لوگ بولنے لگے تو مجھے یقین ہو گیا۔ اب میں نے غصے میں قسم کھائی کہ اگر تجھ سے محبت کروں تو شہید کا لہو پیوں گا۔ اب میں الجھن میں ہوں کہ میں کیا کروں۔ آپ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر قرآن حکیم کے تحت اس کا کوئی جواب دیں کہ میں اس لڑکی سے محبت کروں یا چھوڑ دوں۔؟

جواب: — برادر عزیز! آپ نے اپنی عمر خط میں تحریر نہیں کی۔ دوسرے خط کے سیاق سے محبت کرنے کا بڑا خطرناک مفہوم برآمد ہو رہا ہے۔ ایسا اتفاق کم ہی ہوتا ہے کہ کوئی لڑکی اس قدر فریفتہ ہو جائے کسی پر کہ محبت کے عملی مظاہرے پر اسے مجبور کرنے لگے۔ یا تو آپ اتنے معصوم ہیں کہ کوئی حد درجہ کھیلی کھائی ہوئی عورت آپ کو آغاز شباب میں ہی خزاں رسیدہ کردینا چاہتی ہے اور آپ کو راہ نجات نہیں مل رہی ہے۔ یا آپ اتنے ہوشیار ہیں کہ جو کچھ کر چکے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں اس مراسلت کے ذریعے اس کا جواز فراہم کرنے کے آرزومند ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس گھر میں آپ کا قیام تھا وہاں کی کسی لڑکی کی طرف اگر کوئی پہل ہوئی تو اس گھر کی عزت کا خیال رکھتے ہوئے آپ کو چاہئے تھا کہ اسے اس ارادے سے باز رکھتے۔ لڑکی کے کیرکٹر سے قطع نظر کیا آپ نے اپنے کیرکٹر پر بھی نگاہ کبھی ڈالی اور یہ شہید کا لہو پینے والی قسم کون سی ہوئی۔ بات بات پر اللہ کی قسم سے بھی منع کیا گیا ہے چہ جائیکہ کسی غیر اللہ کی قسم کھائی جائے اور وہ بھی ایسے مکروہ حوالے سے۔

عورت اور مرد کے تنہائی میں ملنے اور ان کی یکجائی کی اسلام میں اگر گنجائش ہے تو صرف رشتہ ازدواج کی رو سے۔ اس کے علاوہ کسی رشتے کو اسلام قبول نہیں کرتا۔ اس دائرے سے باہر لڑکا لڑکی یا مرد و عورت کی ملاقات اور محبت وغیرہ کے بکھیڑے انسان کو صحیح راستے سے بھٹکانے والے ہیں۔ اور میرے بھائی یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ گناہ میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ توبہ کرنے کے باوجود انسان بار بار وہی کرتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود توبہ کے دروازے اللہ نے اپنے بندوں پر بند نہیں کئے ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا ہو اللہ سے اس کے لئے صدق دل سے معافی کے طلب گار رہئے اور دعاء کیجئے کہ اللہ آپ کو اعمال قبیحہ اور ان کے عذاب سے محفوظ رکھے۔

Invitation price Rs. 5/-
1-15 December 1995
Volume 2. Issue 3

The Milli Times International

49, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025 Phone : 6827018 - 6926030

R.N.I. No. 57337/94
RGD. DL No. 11234/95

شیطان کی موت

مثلث نمائے برموداسے متعلق ملی ٹائمز کے انکشافات نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔ دنیا بھر کے مذہبی علماء، خواہ وہ یہودی ہوں یا عیسائی یا مسلمان انہیں حیرت ہے کہ آخر شیطان کے وجود کی اتنی صراحت کے باوجود یہ کیونکر ممکن ہوا کہ رفتہ رفتہ اس کا تصور انسانی دل و دماغ سے محو ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جب اچانک ابلیس کے باغی رفیق سے ملنے والی بعض اطلاعات کو ملی ٹائمز نے اپنے صفحات میں شائع کیا تو علمی دنیا میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوگیا اور بہتوں نے شک اور تذبذب کے ساتھ اس خبر کو قبول کیا اور ایسا صرف مسلم دنیا میں نہیں ہوا بلکہ عیسائی اور یہودی دنیا میں بھی جہاں شیطان کے بارے میں تفصیلات کہیں زیادہ دستیاب ہیں اس خبر سے لوگوں کو حیرت کا احساس ہوا۔ یعنی سائنسی عقلیات کی تحریک نے آج انسان کو ایسی جگہ لا کھڑا کیا ہے کہ وہ شیطان کے وجود، اس کی سرگرمیوں اور جنت اور دوزخ کی موجودگی کو ایک استعاراتی زبان سمجھتا ہے۔ فرانسیسی شاعر بودلیئر نے کہا تھا کہ جب تمہیں یہ محسوس ہو کہ لوگ عقلی اور سائنسی توجیہات کے دیوانے ہوگئے ہیں تو اس وقت شیطان جس بات کی سب سے زیادہ کوشش کرے گا وہ یہ ہوگی کہ وہ لوگوں کو یقین دلائے کہ وہ تو سرے سے وجود ہی نہیں رکھتا ہے اور یہ کہ اس کے بارے میں مذہبی کتابوں میں جو تفصیلات ہیں اس کی حقیقت استعاراتی انداز بیان سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

دیکھا جائے تو شیطان اپنی اس مہم میں پوری طرح کامیاب ہوا ہے کہ آج عام انسانوں کے نزدیک اس کا وجود مشتبہ ہے اور ہمیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں یہ خیال کم ہی آتا ہے کہ ہم نے دن بھر میں کتنا کام شیطان کے ورغلانے میں آکر کیا ہے اور کب کب اس کے ہتھکنڈوں کا شکار ہوتے رہے ہیں۔

گذشتہ دنوں شیطانی دنیا کے بعض حقائق منظر عام پر آنے کے بعد مغرب کے بعض مذہبی حلقوں میں بھی یہ بحث چل پڑی کہ کیا واقعی ابلیس لعین موجود ہے اور اگر ہے تو کہاں ہے۔ اور یہ کہ فی زمانہ انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے اس نے کون کون سے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں؟ اس قسم کے بعض سنجیدہ سوالات پر مشتمل ایک کتاب بھی منظر عام پر آئی ہے جس کا نام

The Death Of Satan

یعنی "شیطان کی موت" ہے مصنف نے اس امر کا سنجیدگی سے جائزہ لیا ہے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی کس طرح سے شیطان کے قابو میں آتی چلی گئی ہے۔ اس پر طرفہ یہ ہے کہ ہمیں شیطان کے پنجوں میں جکڑے جانے کا احساس بھی نہیں ہے

Oh Shit !

انداز فکر ہی نہیں بدلا بلکہ اظہار کا طریقہ بھی بدل گیا۔ کل تک شیطانی افعال کے سرزد ہوجانے تک ہمارے زبانوں سے اکثر بے ساختہ نکلتا تھا استغفر اللہ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ یا اوہ میرے خدا! مغرب کی عیسائی اقوام بھی انہی کلمات کو اوہ گوش، مائی گاڈ جیسے الفاظ سے ادا کرتی تھی۔ یعنی گناہ کرنے والوں کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ان پر شیطان نے غلبہ پالیا اور وہ اللہ کی پناہ کے طالب ہیں۔ لیکن اب مشرق ہو یا مغرب چونکہ شیطان کا وجود ذہنوں سے محو ہوچکا ہے اس لئے ہم شیطان کو مورد الزام ٹھہرانے اور خدا کی پناہ طلب کرنے کے بجائے کہتے ہیں اوہ شٹ۔ عام زندگی میں شیطان کے عمل دخل کو محسوس نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم شیطان کی سازشوں سے غافل پوری طرح اس کے جال میں جکڑ دیے گئے ہیں۔ فلسفیانہ طور پر یہ بات اس لئے سنگین ہے کہ اگر کسی معاشرے سے برائی کے برائی ہونے کا تصور ختم ہوجائے تو وہاں حق کے پنپنے کا امکان بھی ختم ہوجاتا ہے۔ شیطان نے انسانوں کو یہ یقین دلا کر کہ اس کا وجود اور اس سے متعلق تفصیلات فرضی استعارے قصے اور کہانیاں ہیں ایک بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ البتہ ملی ٹائمز کے بعض انکشافات سے پھر سے اس کے جسمانی وجود پر نئے سرے سے بحث چل نکلنے سے مسلم تو کیا عیسائی اور یہودی دنیا بھی متاثر ہوئی ہے

گذشتہ دنوں امریکی جریدے "نیوز ویک" نے امریکہ میں ایک سروے کرایا اور لوگوں سے یہ پوچھا کہ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ابلیس کہیں نہ کہیں موجود ہے؟ چھیاسٹھ فیصد بالغ امریکیوں کا جواب تھا وہ سمجھتے ہیں کہ ابلیس کہیں نہ کہیں موجود ہے اور اپنی شرانگیزیوں میں مصروف بھی۔

مغرب کے مفکرین کا ایک بڑا حلقہ اٹھارویں صدی میں اٹھنے والی عقلیات کی تحریک کو شیطان کی چلائی ہوئی ایک گمراہ کن تحریک تصور کرتا ہے۔ جس کے زیر اثر شیطان کو سب سے بڑی کامیابی یہ ملی کہ احساسات کی دنیا کے آگے کے حقائق سے انسان کا ایمان جاتا رہا۔ اور اس طرح دنیا نہ صرف یہ کہ شیطان کے وجود سے منکر ہوگئی بلکہ اس کی مکروہ چالوں سے بچنے اور اللہ کی پناہ حاصل کرنے کا داعیہ بھی جاتا رہا۔ شیطان کے ہیڈ کوارٹر میں پالیسی امور کے طور پر یہ بات طے پائی کہ شیطان کے موضوع پر غور و فکر کا راستہ ختم ہو اور دنیا اسے محض قصے کہانی سمجھ کر نظرانداز کردے۔ اسی سال امریکہ میں منعقد ہونے والے عیسائی ناشرین کے میلے میں یہ حیرت انگیز انکشاف بھی ہوا کہ لاکھوں کتابوں کی بھیڑ میں جہاں ہر حرف تہجی پر بلامبالغہ لاکھوں کتابیں موجود تھیں وہاں شیطان اور گناہ کے موضوع پر کوئی کتاب بھی نہیں تھی۔ پھر عیسائی دنیا میں اور اب تو بعض سیکولر دانشور بھی اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ شیطان خود انسان کے اندر ہے اور یہ کہ کسی بیرونی شیطانی وجود کا اقرار کرنا اب دانشوروں کے نزدیک ایک غیر دانشمندانہ عمل ہے۔ لیکن برمودا سے متعلق بعض انکشافات نے جب اچانک بعض مسلم، عیسائی اور یہودی علماء کو اس جانب متوجہ کیا تو انہیں یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ نہ جانے کیوں گذشتہ کئی صدیوں سے شیطان کا وجود ان کے دل و دماغ سے محو سا ہوگیا تھا۔

انسانوں کو یہ باور کرانا کہ ابلیس کا وجود فرضی ہے کیا ابلیس کے ہیڈ کوارٹر کی سوچی سمجھی منصوبہ بندی تھی؟ اس کام میں اسے کیسے کامیابی ملی؟ اور کون کون لوگ اس سازش کا آلہ کار بنے؟

اس بارے میں باغی رفیق کے انٹرویو سے بعض دلچسپ حقائق سامنے آئے ہیں جس کے بعض حصے ہم انشاء اللہ اگلے شمارے میں شائع کریں گے۔